

یادِ شمسِ مخیر

قلمی خاکِ مضامین،

فَإِطْمَأَنَّ عَالَمٌ عَلَى

حِصَّۃُ اَوَّلُ

”شخصیات“

اشاعت _____ جولائی ۱۹۸۹ء

تعداد _____ ۵۰۰۰

قیمت _____ ۱۵ (پندرہ روپے)

میلنے کا پتہ

فاطمہ عالم علی

مکان نمبر 7/332-2-8

روڈ نمبر ۳۔ بنجارہ ہلز

حیدرآباد۔ 34

فون 248795

پیارے ابا کے ماحول اور چاہنے والوں کے نام

جن کے خلوص، پیار اور اپنائیت بھرے برتاؤ نے پتھر لیے
اور حوصلہ شکن ماحول میں مجھے با حوصلہ رکھا —

فاطمہ عالم علی

اے قاضی محمد عبدالغفار مرحوم ایڈیٹر ”پیغام“ مصنف ”لیلیٰ کے خطوط“ روزنامچہ حیاتِ اجل
آثارِ جمال الدین افغانی، آثارِ ابوالکلام، سیب کا درخت، تین پیسے کی چھوکری، اس نے کہا،
عجیب، نقشِ فرحک۔

پیش لفظ

زیر نظر کتاب کے تقریباً تمام مضامین فرمائش پر لکھے گئے۔ حبیب علاؤ الدین مرحوم جائنٹ ایڈیٹر ”مِلّیّہ“ کی فرمائش پر ”ابا کے ساتھ چند لمحے“ لکھا۔ حبیب صاحب بہت خوبیوں کے انسان تھے اکثر یاد آجاتے ہیں۔ یہ مضمون ”صَبَا“ میں چھپ کر کراچی پہنچا۔ اکرام احمد صاحب (غائب امر آباد کے رہنے والے ہیں) اس مضمون کو دیکھ کر مجھے لکھا کہ ”سر یعقوب“ پر بھی مجھے لکھنا چاہیئے۔ اس طرح ”میرے ماموں میاں“ وجود میں آیا۔ جناب ڈاکٹر راج بہادر گور صاحب کے حکم پر ”مخدوم صاحب“ لکھا گیا۔ کچھ مضامین آل انڈیا ریڈیو کے لئے لکھے۔ کچھ تعزیتی جلسوں میں لکھے گئے۔ غرض خود قلم لے کر بیٹھنے کی توفیق کبھی نہ ہوئی۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۳ء تک خوب لکھا جس کے لئے میں اردو ہال کی ادبی محفلوں کی ممنون ہوں۔ کتابت و طباعت کا سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ اس میں ہمارے کیلی گرافر محمد محمود صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ مدعی ست اور گواہ دست والا معاملہ رہا۔ باوجود محمود صاحب کے مسلسل تقاضوں کے ہم نے کبھی وقت پر مضمون تصحیح کر کے نہیں دیا۔ اب ان کا کیا دوش۔! محمود صاحب بے حد شریف اور بامروت نوجوان ہیں۔ بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ موجودہ ماحول میں محمود صاحب جیسے لوگوں کا بس اللہ ہی نگہبان! جس شکل میں کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اس کو محمود صاحب کی محنت کا نتیجہ سمجھیے جس کے لئے میں ان کی ممنون ہوں اور دعا گو بھی کہ اللہ پاک ان کو دین و دنیا دونوں میں فرزندِ صالح بنائے۔

فاطمہ عالم علی

میرے ماموں میاں

انسان جب تک زندہ رہتا ہے اس کی زندگی واقعات سے بھرپور رہتی ہے اور جب ختم ہوتا ہے وہی واقعات کہانی بن جاتے ہیں۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کی زندگی سے صرف اسی کی کہانی بنتی چلی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک کہانی سے کئی کہانیاں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی سر یعقوب نے بھی چھوڑی ہے۔ جب تک زندہ رہے اپنی زندگی کے نور سے نہ جانے کتنے دلوں اور کتنے گھروں کو منور کرتے رہے اور جب ایک دن اچانک ختم ہوئے تو ان دلوں اور گھروں کو بھی ہمیشہ کے لئے بے نور کر گئے، بس کہانیاں باقی رہ گئیں۔

سر یعقوب نے علیگڑھ سببی۔ اے اور ایل ایل بی پاس کیا اور مراد آباد میں وکالت شروع کی۔ ان کا شمار کامیاب وکیلوں میں کیا جاتا تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں اپنی وطن پرستی کی وجہ سے ”قوم کہلاتے تھے۔ ان کے خیالات سرسید کے خیالات کا پر تو تھے یعنی جس طرح زمانے کے حالات کے پیش نظر موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سرسید نے انگریز حکومت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا تھا اسی طرح سر یعقوب نے محسوس کیا کہ ہنگام وقت کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے تو قوم کی ترقی اور بہتری کے راستے کٹھن ہوتے جائیں گے چنانچہ اسی قوم پرستی کے جذبے نے وکالت چھوڑ لی ٹھکانے سے بے ٹھکانہ کیا اور انگریز سرکار میں اپنا مقام پیدا کیا۔ عرصہ تک وہ مجلس مقننہ کے رکن رہے پھر نائب صدر اور اس کے بعد صدر ہوئے اس عرصے میں انھوں نے قوم کی بھلائی کے کئی کاموں کو حکومت سے منوایا مثلاً خلع کا قانون بنوانا اور منوانا ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کے بعد سر یعقوب کونسل آف اسٹیٹ اور مرکزی مقننہ کے ممبر ہوئے میرا خیال ہے اسی زمانے میں ان کو سر کا خطاب ملا تھا۔

سر یعقوب کچھ عرصہ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے ان کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ مسلمان تعلیمی

اوپر وہی حیثیت سے اپنے ہم قوموں میں بہت پیچھے ہیں۔ ہندوؤں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ لیکن مسلمان اپنی ضعیف الاعتقادی کے ہاتھوں تباہ تھے۔ جس طرح کسی خاندان کی ترقی خاندان کے ہر فرد کی ترقی پر منحصر ہے اور کسی ایک فرد کی کمزوری سے پورے خاندان کی تباہی کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی کمزوری پوری قوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی اور اسی احساس وجہ نے انکو مسلم لیگ میں شرکت پر اکسایا۔ ۱۹۳۷ء میں جب لکھنؤ میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو سر یعقوب معتمدی کے فرائض انجام دیر ہے تھے۔

ان سے جو کچھ ہوسکا قوم کیلئے کیا لیکن قوم نے قدر نہ کی۔ کبھی ٹوڈی بچہ کہا گیا اور کبھی قوم پرستی کے مخلص جذبہ کو ذاتی اغراض سے وابستہ کیا گیا یا نام نمود کا رسیا کہا گیا۔ لیکن سر یعقوب نے تلخ باتوں کو سننے اور شہرت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے۔ اخباروں میں انکے کارٹون چھپتے تو اس قدر لطف اٹھاتے کہ فریم کر کے ڈرائنگ روم میں سجھا دیتے کسی قوی اخبار میں انکی ہجو چھپتی تو اسکو بھی کمرے کی ذہانت بتا دیتے اور اخبار کو شکریہ کارڈ بھیجنا بھی نہ بھولتے۔

سر یعقوب نے سب تو سنی خوشی برداشت کر لی لیکن ملک کی تفریق کا خیال ان جیسے صلح پسندانہ برداشت نہ کر سکے اور جب پاکستان کے متعلق سوچا جانے لگا تو جس مقصد کے لئے وہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے تھے وہ دم توڑتا نظر آیا اور انھوں نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جب ہر شخص نے دیرھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر تیار کیا تو سر یعقوب کی قوم پرستی کا جذبہ بری طرح مجروح ہوا اور انھوں نے سیاسی میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

سر یعقوب کی ہمدرد عزیزوں میں کیا شک ہو ان سے ایک بار مل لیتا چاہے انکا مخالف ہی کیوں نہ ہو دل میں انکی غفلت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہتا۔ انگریزوں کے ساتھ انکا میل جول انکے ہم وطنوں کو شاق گذرتا دیکھتے تھے کہ اتنا اچھا انسان جس کا دل خدمت کے جذبہ سے لبریز ہے کیوں انگریزوں کے سر میں مبتلا ہے۔ اودھ میں طرح انکو چائل کرنا چاہتے تھے اور جب سر یعقوب ان میدان سے باہر نکلے تو سب ہی کہتا تھا انکی طرف بڑھے لیکن جب نظام حیدر آباد نے انکو بلایا تو انھوں نے

مسلمانوں کی خدمت کے جذبہ کے تحت یہاں آنا پسند کیا۔ حیدر آباد آنے سے دو سال پہلے انکے قلب پر حملہ ہو چکا تھا اور ڈاکڑوں نے زیادہ کام نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنی صحت کے پیش نظر حیدر آباد میں رہ کر خاموش خدمت کو ترجیح دی اور مشیر اصلاحات کی حیثیت سے حیدر آباد آ گئے (حقیقت تو یہ تھی کہ یہاں انکی موت کھینچ لائی تھی) بہر حال وہ خوش تھے کہ انکو پھر کچھ کام کرنے کا موقع ملا اور حیدر آباد خوش تھا کہ سر یعقوب ملے چنانچہ بزرگ ہائی کورٹ جج جناب غلام نجف چیلے کہا۔

کل صبح بنکے وہ غارت گروم آتے ہیں

چوٹ پر ڈھکے کی آتے ہیں بزم آتے ہیں

اختلافات سیاسی کو مٹانے کیلئے

سر محمد جنسین سب کہتے ہیں "موقوف آتے ہیں"

سر یعقوب جس قدر و منزلت کے مستحق تھے وہ انکو حیدر آباد میں بھی بلاشبہ حاصل ہوئی نظام نے بھی انکے پر خلوص جذبہ خدمت کا صلہ دل کھول کر عطا کیا۔ انکو کبھی ایہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ملازم سرکار میں اُن سے ایسے تعلقات پیدا کئے کہ حاکم و محکوم کا فرق برائے نام رہ گیا اور اسکی جگہ دوستی نے لے لی تقریباً ہر روز سر یعقوب لنگ کوٹھی جاتے کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں صرف چند لوگ ایسے تھے جنکی موٹر کو اندر تک جانے کی اجازت ہو اور جنکو کرسی پیش کی جاتی ہو۔ انھی چند میں سر یعقوب کا شمار بھی تھا۔ اکثر اوقات کو فون پر بات ہوتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن لنگ کوٹھی سے خاصہ آنا معمول بن گیا تھا۔ یہاں سے بھی طرح طرح کے کھانے تیار ہو کر نظام کیلئے جایا کرتے تھے جنکا ذکر سر یعقوب کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک حضور اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنے فرمائوں میں کرتے رہے یہ صرف دو سال حیدر آباد میں رہے لیکن آج بھی ان کی مینا فتوں کے تذکرے سننے میں آتے ہیں جنہوں نے ان دعوتوں میں شرکت کی ہے کہتے ہیں کہ بعض کھانے اُسے کھائے جو نہ پہلے کبھی کھائے تھے اور نہ انکے بعد کبھی دیکھنے میں آئے۔

سر یعقوب کا تعلق آباد آباد کے برگزیدہ خاندان سے تھا انکے اجداد ہمسر قند سے

آئے تھے۔ اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے یہ علماء کا خاندان تھا امور مذہبی اور محکمہ قضا کی اہم خدمات انکے سپرد رہی ہیں لیکن سر یعقوب کے والد مولوی محمد اسماعیل نے وکالت کو ذریعہ معاش بنایا اور شاہجہاں پور میں وکالت کرتے تھے اکلوتے بیٹے یعقوب نے بھی باپ کے نقش قدم پر زندگی کی ابتدا کی تھی۔

سر یعقوب کی پہلی شادی قاضی عبدالغفار کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی لیکن وہ ایک سال بھی زندہ نہ رہیں۔ چند سال بعد لاہور کے شمس العلماء مولوی مختار علی صاحب کی اور ”تہذیب نسواں“ والی حمید بیگم کی صاحبزادی امتیاز علی تاج کی بہن وحیدہ بیگم سے شادی ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کی قابل بیویوں میں گنی جاتی تھیں کہتے ہیں صورت شکل کی بہت اچھی تھیں قابلیت سے کسکوانکا رہ سکتا ہے۔ علم و ادب کے گہوارے میں پلی تھیں۔ مراد آباد میں عورتوں کی علاج کے لئے پہلا قدم انھوں نے ہی اٹھایا، تعلیم نسواں کا سلسلہ جب وحیدہ بیگم نے چھیڑا تو ہر طرف سے ان پر مخالفت کی بوجھار شروع ہو گئی، کیونکہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم گویا مذہباً ناجائز تھی۔

لیکن یہ بھی دھن کی بچی تھیں اپنی ہی سسرال کی چند لڑکیوں کو جمع کر کے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جو آج بھی وحیدہ گریڈ اسکول کے نام سے چل رہا ہے، یہ بھی بہت مختصر عمر لیکر آئیں چند سال شوہر کے ساتھ گزاریے اور دنیا سے سفر کر گئیں۔

محترمہ نذر سجاد حیدر صاحب نے ان پر ایک مثنوی لکھا تھا جو میری نظروں سے بھی گزرا ایک شعر یاد رہ گیا ہے وہ یوں تھا۔

دنیا میں ابھی آئے نہیں عرصہ نہ ہوا تھا
کیوں جلد سفر تم نے کیا ہائے وحیدہ

عرض انکی قابلیت اور چند سال کی رفاقت نے سر یعقوب کے دل پر کچھ ایسا نقش چھوڑا کہ وحیدہ بیگم کے بعد کبھی شادی کا خیال نہ کیا اور تمام عمر انکی یاد میں تنہا رہ کر گزاری۔

ابھی تک تو آپ سر یعقوب کے بارے میں سنا اب ذرا میرے ماموں میاں سے بھی مل لیجئے۔

یہ کوئی دوسرے صاحب نہیں بلکہ وہی سر یعقوب ہیں۔ آپ نے وہ مثل تو سنی، ہوگی کہ ”ماموں کے کانوں بالیاں بھانجی اینڈی اینڈی پھرنی“ اور وہ مجھ پر صادق آئی ماموں میاں کو تو کبھی شان و شوکت کا احساس نہ ہوا لیکن ہم اس قدر اتر آئے اور اکڑے کے لقا کبوتر ہو کر رہ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں جتنا بھی اکڑوں کم ہے کیوں مویہ صرف میرے ماموں نہیں بلکہ ماں بھی تھے۔

دیکھئے تو کس طرح کہانی میں کہانی لگتی چلی آتی ہے میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر ماموں میاں کی کہانی کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں دماغ میں خیالات کا جھوم ہے اور ان کا ساتھ دینے سے قلم قاصر آیا وہ کہانی ہے کہ زندگی بھر لکھوں تو ختم نہ ہوانکی زندگی کا ہر لمحہ میرے لئے اہمیت رکھتا ہے ماموں میاں کے حالات زندگی لکھوں اور اپنا ذکر بار بار نہ لاؤں یہ ناممکن سی بات ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گی کہ جو کچھ لکھوں انھیں پر لکھوں۔

ماموں میاں اپنی دونوں بہنوں سے بڑے تھے میری والدہ ماموں میاں سے چودہ سال چھوٹی تھیں۔ میری خالہ اور خالو ان کے ساتھ رہتے تھے ان کے ایک لڑکا تھا قاضی صاحب کی پہلی لڑکی زہرہ تھیں اور آخری میں جو بہن سے بارہ سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چار بھائی تھے جنکی عمر زیادہ نہ ہوئیں۔

میری پیدائش کے دس دن کے بعد میری والدہ ۲۸ سال کی عمر میں دنیا سے رحلت کر گئیں، اور اپنی امانتیں اپنے چھتے بھائی بہن کے سپرد کر گئیں۔ پاپا بابا کی لاڈلی تھیں اب اسے دور رہنا انگوٹھی قیمت پر گوارہ نہ تھا اس لئے وہ تو اپنے والد کے پاس رہیں اور مجھے خالہ ماموں اپنے گھر لے آئے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ ”وہ ماں مرے موسیٰ جسے“ لیکن ہماری قسمت میں خالہ کا شکھ بھی نہ تھا۔ میں ابھی صرف چند سال کی تھی کہ ایک دن چاچا نک (اماں خالہ کو کہتی تھی) اماں کہیں چلی گئیں سارے گھر میں، تلاش کے بعد بھی نہ ملیں تو میں نے ماموں میاں سے پوچھا ”میری اماں کہاں ہیں؟“ ماموں میاں نے بڑی آہستگی سے کہا ”تمہاری اماں تو مٹی کی تھیں مٹی میں مل گئیں“ اور کئی دن تک میں عجب عجیب بات ہر آنے جانے والے کو سناتی رہی۔ اس وقت میری عمر مشکل سے چار سال ہوئی لیکن

ماموں میاں کے وہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں اور اب یہ بات کتنی صاف اور واضح ہو گئی ہے کیونکہ خالو مامو میاں، ابا اور آپا سب ہی مٹی میں مل چکے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

تو اس طرح میں ماموں میاں کے پاس آ گئی وہ لاولد تھے ماں کا پیار ماموں نے دیا اور خالہ کا پیار خالو نے اس طرح دیا کہ پھر خالہ یاد نہ آئی میں اپنے خالو ہی کو بابتی تھی ان دونوں نے جس طرح میری پرورش کی وہ انہیں کا حق تھا اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ پاک نے ایک ماں لیکر اس قدر کتنی ماؤں کی ماہتا ان کے دلوں میں ڈال دی تھی کہ کسی وقت میری کسی حرکت سے انکی تیوری پر بل نہ آتا میں ضد کرنے کے لئے نئے دھنگ ایجاد کرتی نرالی چیزوں کی فرمائش کرتی نہ فرمائش کا کوئی وقت ہوتا نہ منوں کا کوئی موقع لیکن میرے منہ سے بات نکلتی تو ہو کر رہتی دن کو رات کہتی تو یہ بھی ہم زبان ہو جاتے اپنے جیسے۔ اچھے برتن تو لڑ کر اسکے ٹوٹنے کی آواز سے لطف اٹھاتی تو ماموں میاں برابر کے شریک ہوتے کئی مرتبہ آدھی رات کو چٹری اڑھ کر جھولنے کی فرمائش ہوتی تو اسی وقت پوری کی گئی بیچ رات میں آنکھ کھل جاتی ابا (خالو) کو قریب نہ پاتی تو آفت آ جاتی اگر وہ تہج کا وضو کئے ہوتے تو جان کھا جاتی کہ پہلے جیسا منہ تھا ویسا لگے اور وہ چہرے پر رکھ مل کر کہتے دیکھ بیٹی جیسا پہلے تھا ویسا ہو گیا کہاں تک سنائوں اب تو مجھے بھی وہ گزری باتیں جھوٹ معلوم ہوتی ہیں تو سننے والوں کو یقین کیسے آ سکتا ہے لیکن وہ حقیقت تھی۔

میری ان بے جا ضدوں کے موقع پر کبھی میرے والد آ جاتے تو بہت الجھتے اور ماموں، میاں سے کہتے ”یعقوب تم نے اسکی مذیل اٹھا اٹھا کر اس کا سیتا ناس کر دیا“ یہ جملہ ماموں میاں کے لئے بہت اذیت دہ ہوتا اور وہ جواب دیتے ”پیارے میاں (گھر کا نام) تم اطمینان رکھو تمکو، فالہ کی ضدوں سے تکلیف نہ ہوگی وہ ہم سے ضد کرتی ہے تکلیف ہوگی تو میں ہوگی وہ تمہارے پاس ضد کرنے نہ آئے گی“ ماموں میاں جب پیارے میاں کو اطمینان دلا رہے تھے تو وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ فالہ کو منجھار میں چھوڑ کر ہی جلنے والے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے والد سے بہت دور رہی اتنا دور کہ اکثر انکو پہچاننے میں تکلف

جب میں کھنڈ میں پڑھتی تھی اور بورڈنگ میں رہتی تھی ہر ہفتہ چھٹی پر آیا، پاس آجاتی تھی
 قحطی میرے بہنوئی کھنڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے ایک بار اسی طرح میں آپ کے پاس آئی بیڑا تھی۔
 میں نے چلن سے دیکھا ایک صاحب مع سامان کے تانگے سے اتر رہے ہیں میں بھاگی بھاگی اندر گئی
 اور آپ سے کہا ایک صاحب آئے ہیں بالکل آپ کے بابا جیسے ہیں آپا ایا کا نام سنکر بے قرار ہو کر چلن کے
 پاس پہنچیں اور دیکھا تو پلٹ کر مجھ سے بولیں ”چوہیل یہ تو بابا ہیں تو ایا کو بھی نہیں پہچانتی“
 میری یہ دوری محض اس لئے تھی کہ میری بے جا حرکتوں پر میرے والد کہیں مجھے ڈانٹ نہ
 دیں ماموں اور خالو مجھے یوں چھپائے رکھتے جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں سیٹھے رہتی ہے۔
 حالت یہ تھی کوئی مجھ سے زور سے بات کرتا تو گھبرا جاتے کہتے آہستہ آہستہ سمجھا کہ بات کرو جیتنے
 کی کیا ضرورت ہے۔

میرے ساتھ تو جو کچھ ان کا طریقہ تھا وہی آپا اور میرے خالو زاد بھائی (میرے لئے بھائی بڑے بڑے
 تھے) کے ساتھ بھی ان کا یہی حال تھا۔ آپا جب سسرال سے آئیں تو بڑے اہتمام کئے جاتے جب
 تک رہتیں دن عید رات شب برات رہتی۔ صبح سے شام تک خاندان کی بیگمات آنا جانا لگا
 رہتا اور بھائی تو گویا انکے گھر کا چران تھے۔

ہملوگوں کے لئے انھوں نے بڑی قربانیاں کیں ہیں۔ ہماری خوشی انکی خوشی تھی، ہمارا دکھ انکا
 دکھ تھا انکا ذاتی شاید دکھ تو ہو لیکن خوشی ہم ہی وابستہ تھی جب انکو افریقہ کا سفیر بنا کر بھیجے
 جانے کا بیشکش کیا گیا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میری بچی ابھی چھوٹی ہے اور
 سررضائی کا نام دیدیا یہ اچھے بچپن سے اسکول اور کالج کے ساتھی تھے دونوں میں بید
 محبت تھی۔

جب ماموں میاں ۱۹۴۲ء میں ولایت گئے تو میں آپا کے ساتھ حیدر آباد والد کے پاس
 آگئی کچھ دن بعد آپا پہلی گئیں اور باپ نے مجھے روک لیا اور اسکی اطلاع ماموں میاں کو کر دی ؛
 ماموں میاں بے قرار ہو گئے اور آیا کو لکھا کہ فاطمہ کو سیدے میاں کے پاس چھوڑ کر تم نے

ابا کے ساتھ گذرے ہو چند لمحے

یوں تو مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھا بھی کروں، مگر جی کی نہ پوچھے وہ تو بہت کچھ چاہتا ہے لکھوں تو جب کہ لکھنا آئے کسی مرتبہ لکھنے کے ارادے سے بیٹھی مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اپنا لکھا خود بڑھا تو خاک سمجھ میں نہ آیا گھبرا کر یہ ارادہ کر لیا کہ صرف ”زبانی لفاظی“ پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔

اب اسے بد قسمتی ہی کہیے کہ میں نے اپنے اس لکھنے کے شوق کا اظہار اپنے چند دوستوں سے کیا تھا اور سچ پوچھے تو انھیں لوگوں کے عنایت آمیز اصرار کا آج مجھے شکار بننا پڑا چنانچہ ایک عرصہ تک یہ خوش فہمی بھی رہی کہ قاضی صاحب کی بیٹی کے ہاتھ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے۔ تاہم بہت جلد یہ خوش فہمی دور ہو گئی اور یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اگر باپ ادیب یا صحافی تھا تو ضروری نہیں کہ میں بھی ادب کے میدان میں کود پڑوں صاحب یہ تو اللہ کی دین ہے۔

ابا ہی کو لیمے ان کا سارا شجرہ اٹھا کر دیکھ ڈالیے سیاسی باغی تو ان کہ پڑکھوں میں ضرور ملیں گے۔ لیکن مصنف قسم کی کوئی مخلوق نظر نہ آئے گی۔ بہر حال بہت غور و فکر کے بعد آج ابا کی زندگی کے چند واقعات مضمون کی شکل میں پیش کر رہی ہوں۔ اگر مضمون پسند آجائے تو اسے ابا ہی کا روحانی فیض سمجھئے اور پسند نہ آئے تو مجھے معاف کیجئے میں صرف گیارہ دن کی تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور مجھے میرے ماموں مہر محمد یعقوب نے گود لے لیا ان کے کوئی اولاد نہ تھی میں انھیں کہ پاس رہتی تھی ابا کے پاس میرا آنا جانا ایک بے تکلف مہمان کی طرح ہوتا تھا اور جب ابا حیدر آباد آگئے تو پھر ان سے دو دو سال ملاقات

مے قاضی محمد عبدالغفار۔

نہ ہوتی تھی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو اچانک ماموں میاں کا انتقال ہو گیا یہ میری زندگی کا پہلا زبردست حادثہ تھا۔ ماموں میاں کے انتقال کے بعد مدھو لگے وٹن پر چلے تھے جہاں سے ہم کے مصداق یوں سمجھئے کہ میں دوبارہ بابا کے گھر پیدا ہوئی اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یا تھی پھر نے گاؤں گاؤں جس کا تھا اُس کا ناوی۔

ہاں تو جس وقت میں بابا کے پاس آئی اخبار ”پیام“ اپنے شباب پر تھا۔ بابا بھرمصرف رہتے تھے حد یہ ہے کہ گھر میں بھی آتے تو آبا کم اور ایڈیٹر زیادہ معلوم ہوتے جب دیکھئے کچھ لکھ رہے ہیں، اور اگر اتفاق سے ہاتھ میں کاغذ پینسل نہ ہو تو کچھ سوچ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا کہ دماغ میں کوئی مضمون تیار ہو رہا ہے اس قدر رکھوئے ہوئے رہتے کہ ان کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں کیا کر رہے ہیں، اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں میں نے نہایت محبت سے کباب کی پلیٹ سامنے کرتے ہوئے چونکا نے کہ خیال سے کہا ”بابا کباب لیجئے بہت مزے کے ہیں“ اور بابا نے گویا سخت مصروفیت کے باوجود جواب دینے کی زحمت گوارہ کی اور فرمایا ”ارے بھئی مجھے فرصت نہیں ہے“۔ اب بتائیے کہ کباب کی پلیٹ نہ ہوئی پلٹنک کے پروگرام کی اسکیم ہوئی کہ جس کو عیدیم الفرضی کی بنا پر ٹھکرا دیا گیا اب یہ فرض بھی تھی کو ادا کرنا پڑتا کہ ان کو یاد دلایا جائے کہ جناب دفتر میں نہیں کھانے کی میز پر ہیں چنانچہ کان کہ منہ لے جا کر زور سے کہتی ”یہ دسترخوان ہے“ فوراً مسکرا دئے اور بڑے پیار سے کہتے ”کیوں شامت آئی ہے“ اور کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بابا ہر چیز بھول جاتے سولے کتاب اور پینسل کے یہ چیزیں تو جیسے ان کی زندگی کا لازمہ بن گئی تھیں۔ بعض مرتبہ سگریٹ کی جگہ پینسل منہ میں رکھ لیتے اور کئی کئی بار جلانے کی کوشش کرتے جو بھی اس وقت ان کی یہ حرکت دیکھ لیتا ان کو یاد دلاتا کہ آپ کہ منہ میں سگریٹ نہیں پینسل ہے اپنی اس حرکت پر بے ساختہ ہنسنے پڑتے اور لاملوں پڑھنے لگتے یہی حال عینک کے ساتھ تھا اکثر عینک چوسے

پیر ہوتی اور منہ دھو ڈالتے۔ بابا کی عادت تھی کہ رات کو جب پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے تو عینک پیشانی پر کھسکا لیتے (بابا نے پڑھنے کیلئے کبھی عینک استعمال نہیں کی) اور اس وقت کسی کام سے اٹھتا ہوتا یا کوئی صاحب ملنے آجاتے تو فوراً بستر سے اٹھ کر عینک کی تلاش شروع کر دیتے بڑی لجاجت سے پوچھتے ”بھئی فاطمہ تم نے کبیں عینک دی تھی ہے؟“ اور میں بھی گویا ان پر احسان کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہتی ”جی ہاں آپ کی پیشانی پر رکھی ہے“، عینک فوراً آنکھوں پر آجاتی۔۔۔ اور کہتے ”اچھا دیکھ ابھی آکر کیسی مرمت کرتا ہوں؟“ اور باہر چلے جاتے خیرات عینک اور پینسل تک رہتی تو بھی مصالحت نہ تھا مگر معاملہ بھول کا کافی طویل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ عالم علی صاحب نے (جن سے میری منگنی ہو چکی تھی) بابا کو فون کیا اور بابا نے انھیں نہ پہچانا، وہ بیچارے اپنا نام بتاتے رہے اور بابا کو اصرار رہا کہ معافی کیجئے میں آپ کو نہیں پہچان رہا ہوں، جب انھوں نے کہا میں ہاشم علی صاحب کا لڑکا ہوں تو ان کو اپنی غائب دماغی پر بہت کوفت ہوئی اکثر لوگوں کے نام تو نام کھریا ہوں۔ تو ان تک بھول جاتے اور اس بھول کی بدولت مغرور کھلاتے۔ غرض آٹے صورت تک بھول جاتے اور اس قسم کے بسیوں واقعات ہوتے رہتے۔

بابا کے زمانے میں جمعہ کو حیدرآباد میں عام تعطیل ہوا کرتی تھی جمعرات کی شام سے بابا کے یہاں چھٹی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں کبیں نہ کبیں پکنک منانے کا پروگرام بنتا۔ موسم کے لحاظ سے کھانے پکاتے۔ اگر باہر نہ جاتے تو گھر پر ہی کبھی پھٹی کبھی شطرنج جیتی اور آیا جو ایک ہفتہ تک گھر میں رہتے ہوئے بھی اتنے رہنے کے برابر ہوتے تعطیل کے دن وہ واقعی ہم لوگوں کے درمیان ہوا کرتے۔

بابا نوکروں پر بہت کم غصہ کرتے ہاں اگر ان کے کپڑوں کی دیکھ بھال میں زرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو نوکروں کی شامت آجاتی۔ کسی نوکر پر غصہ کا یہ انداز بھی خوب بدوتا کہ جس قدر شدت کے ساتھ غصہ آتا اسی قدر ادب سے گفتگو کرتے یعنی

آپ اور جناب سے نوکروں کو غنی طلب کرنے لگتے۔ ابا کو بدولتِ عافہ بہت کم آتا تھا۔ دفتر میں یا گھر پر ہی کوئی بات خلاف مرضی ہو جاتی تو خاموش ہو جاتے اور اپنے پڑھنے لکھنے کے کسرے کی صفائی شروع کر دیتے۔ تمام کتابوں اور میز کی صفائی ہو جاتی اخیا جن کا ہر طفرہ و تعمیر کا ہوتا قرینے سے ایک جگہ رکھ دیئے جاتے (پورنہ اپنے پڑھنے لکھنے کے سامان کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی) لکھرے کی بھاڑ پونچھ گویا یہ اعلان ہوتا کہ ابا کو غصہ آگیا ہے۔ سارے گھر کو چپ لگ جاتی۔ میں جو ابا کے سب سے زیادہ منہ جڑھی تھی نہ جانے کیوں میری زبان کو تالا سا لگ جاتا اور اس وقت یہ احساس ہوتا کہ ہم لوگ ابا سے کس قدر مرعوب ہیں خدا جانے کیا بات تھی کہ ہم نہ ڈرتے ہوئے بھی ان کے بگڑے تیور دیکھ کر سہم جاتے عام طور پر ابا کا غصہ معیادی ہوتا تیسرے دن خود بخود بھلے چنگے ہو جاتے گھر بھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی اور ہماری زبانیں پھر قینچی کی طرح چلنے لگتیں بغرض یہ بڑا پر لطف زمانہ ابا کے ساتھ گزرا ویسے تو یہ اچھا خاصہ طویل زمانہ ہے مگر سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند لمحے ابا کے ساتھ گزارے ہیں۔

پھر حیدر آباد کے حالات بدلے اور ان بدلے ہوئے حالات نے ابا کو حیدر آباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا، اور ابا لکھنؤ آگئے لکھنے لکھانے کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا لیکن دفتر کا جھگڑا نہ تھا۔ گھر پر ہی محاورے جمع کرنے کا شوق ہوا کوئی دلچسپ محاورہ نظر سے گذرتا تو ہم لوگوں کو بھی سنا دیا اور اظہار خیال کا موقعہ دیتے کبھی کبھی دوپہر کو کوئی پرانا واقعہ یا کتب سے کوئی کہانی پڑھ کر سنانے ایک مرتبہ ”غبارِ خاطر سے پیڑیا چڑے کی کہانی“ سنا فی ایک تو کہانی بڑی جاندار اس پر ابا کے سنانے کا دلچسپ انداز آج بھی انکی آواز کانوں میں گونجتی ہے بس لطف آگیا تھا جی چاہتا کہ ابا کہانی سنا تے ہی رہیں۔

کبھی کبھی رات کو کھانے کے بعد بیت بازی کا موڈ آ جاتا تھے سب ابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے پارٹی بنتی تو سارا گھر ایک طرف اور ابا تنہا پھسرتے ساتھ ابا پر پابندی لگادی جاتی کہ جناب فارسی کا شعر نہیں چلے گا لیکن اتنی پابندیوں کے باوجود ہمارے پاس اشعار

کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور جیت بابائی کی ہوتی۔ تقسیم ہندوستان کے وقت جو فسادات ہوئے انہوں نے ابنا کو بہت متاثر کیا ان کو اپنے بچپن کے ہندو مسلم تعلقات یاد آجاتے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی پرانا واقعہ اپنے ہندو دوستوں کا لے بیٹھے ایک مرتبہ سردیوں کا موسم تھا کمرے میں انگیٹھیاں لگ رہی تھیں سب لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے بیٹھے فسادات پر اظہارِ خیال کر رہے تھے بابا نے اپنے دادا کا واقعہ شروع کر دیا کہنے لگے ”بھئی یہ سب گوری چوری کی لگائی آگ ہے ورنہ ہم نے ہندو مسلم اتحاد کا وہ رنگ دیکھا ہے کہ کسی مسلمان مسلمان میں اتحاد نہ ہوگا۔ جب دہلی میں غدر ہوا تو اس وقت ہمارے دادا (قاضی حامد علی)، مراد آباد کے قاضی تھے اور ہمارے والد کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ دہلی کے قلعہ میں کچھ امیر برپا تھا اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مراد آباد کی طرف آنکلا، نقصا نفسی کا عالم تھا کوئی شہزادے کو پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے شہزادے کو اپنے یہاں چھپا لیا۔ انگریزوں کے پڑھو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے کسی نے خیر بردی کر مراد آباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دیکر غداری کی ہے شہر میں کھلبلی مچ گئی ہمارے دادا کے دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا آپ کی خیر نہیں خدا کیلئے روپوش ہو جائیے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے، مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں نے غداری نہیں وفاداری کی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا۔

چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انگریز ان کو پکڑ لے گئے اور انہیں پھانسی دیدی۔ ادھر بھانسی ہوئی ادھر وادی کو موجوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائیداد ضبط کر لی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم سے ہر شخص خائف تھا۔ قاضی جی کی بیوی کو پناہ دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے رات گزارنے کیلئے جگہ دے دی۔ آدھی رات کا وقت ہو گا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی سارے گھر کی جیسے جان کل گئی لیکن مسلسل کنڈی کی آواز پر میرتا

کیا نہ کرتا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ایک لالہ آئے ہیں۔ اور قاضی جی کی بیوی سے
 بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دادی نے دروازے کی اوٹ سے آنے کی وجہ پوچھی تو
 لالہ نے کہا نہ بہن قاضی جی کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے اس کے لئے بھی کچھ سوچا
 ہماری دادی نے کہا ”بھلا لالہ آدھی رات وہ بھی قیامت کی طرح عجیب و غریب کیا کرتی
 ہوں؟“ لالہ نے ہمت دلائی اور کہا چلو ”ان کی لاش تلاش کر کے کچھ انتظام کریں“ ابا
 نے ایک خاں مسکراہٹ کے ساتھ لمبی سانس لی اور کہنے لگے ”اس زمانے کی عورتیں
 جنہوں نے زندگی میں کبھی قدم گھسے باہر نہ نکالا ہو وقت پڑنے پر مرد سے زیادہ،
 ہمت کر جاتی تھیں غرض ہماری دادی لالہ کے ساتھ جہاں سو لی لٹکائی گئی تھی وہاں
 پہنچیں اور ہزاروں لاشوں میں سے شوہر کی لاش تلاش کی، وہیں پر ایک گڑھا کھودا
 اور لاش دفن کر کے نشانی کے طور پر ایک لکڑی لگا دی اور گھرا گئیں۔ اس کے بعد جب
 حالات درست ہوئے اور ہمارے دادا بے قصور ثابت ہوئے جان تو اس نے
 اسکی بہن انگریزوں نے بڑی عنایت کی کہ مکان اور جائیداد واپس کر دی بلکہ کچھ
 انعام بھی دیا۔ پھر اس وقت ہمارے دادا کی قبر بھی بنوائی گئی۔ کیونکہ دفن کرتے وقت
 کسی کو ہوش نہ تھا کہ سر کس طرف ہے اور پاؤں کدھر چن پھر اس لکڑی کی مدد سے
 قبر پہنائی گئی اور چوڑی قبر بنادی گئی اور وہی حشر کا میدان ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا
 جب اب مقدمہ ختم کر چکے تو میں نے پوچھا کہ آخر وہ لالہ کون تھے جن کو قاضی جی سے اتنا
 لگاؤ تھا کہ اتنی ہمت کر گئے تو اب انے کہا کہ ”اس زمانے میں لوگ بڑے وضع دار
 اور مخلص ہوتے تھے محلہ تبا کو والا میں ہمارے گھر کے قریب ان لالہ کی ایک جھوٹی سی
 دکان تھی ہمارے دادا شام کو اس دکان پر جا کر بیٹھا کرتے تھے آج کل نہ ویسے
 دکان دار ہیں نہ ویسی دکانیں اس زمانے کی دکانوں پر بیٹھکیں جما کرتی تھیں ادنیٰ
 محفلیں بیوتی تھیں حالات حاضرہ پر تبصرے ہو کر تے تھے ان لالہ کے گھروالوں کا
 بھی ہمارے یہاں آنا جانا تھا بس یہی تعلقات تھے جن کی بنا پر لالہ نے ہماری دادی

کا ساتھ دیا۔ ہمارا کمپن تھا لالہ کا انتقال ہو چکا تھا ہمیں یاد ہے کہ جب تک دیدی یعنی وہ
کی بیوی دلہن کا منہ نہ دیکھ لیتی گھر کی لڑکیاں بے چین رہتیں مگر منہ دیکھ نہ پائی اور
رہتی۔ دیدی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آتیں اپنے ہاتھ سے دلہن کا گونگھٹ
اٹھاتیں دعا دیتیں اور اپنی میلی ساری کے کورنے سے ایک اٹھنی کھول کر دلہن کے
ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ اسکے بعد منہ دکھائی شروع ہوتی۔ تو بھئی یہ تھے ہندو مسلم تعلقات
دو دنوں اپنے اپنے مذہب کے سختی سے پابند تھے اسکے باوجود بھائی چارہ قائم تھا
ابا نے قہقہہ ختم کر دیا اور ہم سوچنے لگے کہ واقعی جن لوگوں اتحاد کے یہ مناظر دیکھے
وہ اب کیوں کر جی سکتے ہیں۔

قہقہہ کہانوں کے علاوہ ابا کو گانا، سننے کا بہت شوق تھا۔ استاد دی گانوں کا شوق۔
ریڈیو سے پورا کرتے اور گھر میں اکثر شام کو ڈھولک جیتی وہ گیت جس میں بیٹی سرسرا
میں رہ کر اپنے کنوارے پن کو یاد کرتی ہے بہت بھاتے اور بابل سن کر توان کی عجب
کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔

ابا قہقہہ مار کر بہت کم ہنستے اور اگر کسی وقت بے قابو ہو کر ہنس دیتے تو جلد
ہی اس پر قابو پالیتے ایسا معلوم ہوتا جیسے زور سے ہنس کر انھوں نے کوئی بڑا غلہ
کئی ہو۔ ابا کو عمدہ کھانے اور بہترین کیڑوں کا یہی شوق تھا کپڑا ہمیشہ بہت اچھے
پہنتے بڑے جامہ زیب بھی تھے جوڑیدار پاجامہ پر جب جہرنگ ٹوپی اور شیر وافی
پہن کر باہر نکلتے تو میں اکثر جھوٹ موٹ کچھ بڑھکڑھوکتی اور کہتی کہ خدانے کمرے کو
بلا ساتھ نہ لگ جائے تو ہمیشہ کہتے ”دیکھ کچھ دیتا ہوں منہ کو لگام دینا سیکھ ورنہ
سسرال میں جوتے کھائے گی“ جھومتی ہوئی چال پر تو جانے ابا نے کتنوں کو قہقہہ
کیا ہوگا وہ بھلا تم کو کیوں بتلانے لگے!!

ابا کی کتاب زندگی میں کفایت شعاری کا کوئی باب نہ تھا، اور میں یقیناً
کہہ سکتی ہوں کہ جو کچھ کہاتے کھانے اور کھلانے پر اڑا دیتے۔ ابا نے حساب کیا

کا جھگڑا کبھی مول نہ لیا اور ہمیشہ سولہ سو کے ہزار کرتے رہے ان کو کبھی اخبار ”پیام“ کی آمدنی کا علم ہوا نہ گوئے اخراجات کے حساب لکھنے کا ان کو خیال آیا نہ کہتے خرچ ہو جانے کے بعد حساب لکھنے سے کیا حاصل ؟

ابا دعوتیں بھی بہت کرتے تھے جب دعوت کا دن آتا تو سارا دن پریشانی میں گزرتا دو باتوں کی فکر رہتی ایک تو کھانا عمدہ پکے دو سے کم نہ پڑے ان چیزوں کے متعلق ، دن بھر میں اتنے سوالات کرتے کہ ہم لوگوں کے ہاتھ پیر پھلا دیتے طبیعت میں جلدی بھی غضب کی تھی اور اپنی جلد بازی میں اچھا خاصا کام اوندھا کر دیتے یہ بھی عالم تھا کہ تھا جب کسی بات پر صبر نہ آجاتی تو خود ہی نقصان اٹھاتے لیکن ہڈ پوری کر کے رہتے ۔ معمولی معمولی چیزوں کو جن کی طرف بارادھیان بھی نہ جاتا ابا اس کی گہرائی پہنچ جاتے ۔ ایک دفعہ کا بڑا دلچسپ واقعہ یاد آگیا ۔ آپ بھی سنئے ایک دن ہم نے دیکھا کہ ابا صحن میں کبوتروں سے گفتگو میں مصروف ہیں جب ہم نے دیکھا کہ ایک کبوتری ابا ، گمی گمود میں بیٹھی ہے اور کبوتر بڑی بے قراری سے ادھر ادھر پھر رہا ہے سینہ تان کر آتا ہے اور ابا کے پیروں میں چوڑخ مارتا ہے ۔ کبھی دم اٹھا کر سے لگا لیتا ہے کبھی چوڑخ زمین پر مارتا ہے ، کبھی پاؤں بٹھکتا ہے ہم لوگوں نے پوچھا آخر یہ معاملہ کیلئے کہنے لگے ”میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں یہ بد معاش خود تو کھلتے ہی کا ایک سے باہر اگر دانہ حقور نے لگتا ہے اور یہ غریب کبوتری باہر نکلی کے اس کے اطراف ناچ ناچ کر اور چوڑخ مارتا کر اسے کاہک میں بٹھا دیتا ہے ۔ بیماری کو پیٹ بھر کھانے بھی نہیں دیتا“ پھر کبوتر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”جب تک ابھی طرح زمین پر ناک نہ رگڑو ورنہ کبوتری نہیں چھوڑو نہ“ ہنرور کوئی مولوی خاندان کا معلوم ہوتا ہے ، ہم لوگوں نے کبھی محسوس بھی نہ کیا تھا کہ اتنے کبوتروں میں ایک مولوی بھی ہے مگر ابا نا تو اور اس کو سزا دیکر اپنی تشفی بھی کر لی جو مولوی صرف عورت کے تعلق سے اعظا کرتے اور صرف عورت کے فرائض گناتے ایسے مولویوں سے ابا کو نفرت تھی

کہتے ان لوگوں نے عورت کو اس کے جائز مقام سے محروم کر دیا ہے۔
 ابا کو طلبہ سے بڑی دلچسپی تھی اگر انکے سامنے کالج کے کسی لڑکے کی بدتمیزی کی
 شکایت کی جاتی تو بڑی ہمدردی کے ساتھ کہتے: ”ارے بھئی ان بچاریوں کو کچھ
 نہ کہا کرو یہی چند سال تو ان کی زندگی میں بے فکری کے ہوتے ہیں کالج سے
 نکلنے کے بعد یہ غریب دنیا بھر کے تھمیلوں میں گرفتار ہو جائیں گے ان کو تو معاف
 کر دینا چاہئے“

حیدر آباد سے آنے کے بعد ابا کی صحت گرنے لگی اور علی گڑھ آکر تو باقاعدہ
 بیمار ہو گئے۔ بیمار کی تشخیص میں کئی سال گزر گئے بمبئی میں پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم
 ہوا کہ جگر میں کینسر ہے جس ہمت سے ابا نے بیماری کا مقابلہ کیا بہت کم ایسے لوگ
 دیکھنے میں آئے۔ آپریشن کے بعد حیدر آباد آئے اور یہاں سے دہلی جا رہے تھے
 تو اسیا معلوم ہوتا تھا کہ آپریشن کروا کے ہیں تفریح کر کے آئے ہیں۔ آپریشن کی وقت
 ڈاکٹر مقبول علی صاحب موجود تھے وہ ابا کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔

حیدر آباد کے اسٹیشن پر دوست احباب جمع تھے گاڑی روانے ہونے کو تھی مقبول
 علی صاحب امرار کر رہے تھے کہ ابا سوار ہو جائیں اتنے میں گاڑی نے حرکت
 کی ابا یہ سمجھتے ہوئے کہ ”ابو ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے بڑھا سمجھا ہے کیا؟“
 چلتی ٹرین میں اچک کر سوار ہو گئے اور سب لوگ حیران تھے کہ کیا واقعی ان کو
 کینسر ہے؟ ابا چند مہینے ٹھیک رہے یوں تو بڑھری بیماری کے دوران کبھی کام سے
 پیچھے نہ ہٹے لکھنے پڑھنے کا تو یہ حال تھا کہ ریل ہو یا ہوائی جہاز میں ہوں یا ستر
 پر قلم چلتا ہی رہتا ہاتھ کے ہلنے یا بے ڈھب ہونے سے ابا کے لکھنے پر کوئی اثر
 نہ پڑتا اور یہ ایک عجیب بات تھی! وہ ہر جگہ اطمینان سے لکھ سکتے تھے بلکہ ٹرین
 میں اکثر ٹائپنگ کرتے۔

غرض بیماری نے زور پکڑا، کینسر نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا درد کے

تکلیف رہنے لگی اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہاتھ میں قلم ہوتا دوسرے ہاتھ سے گرم پانی کی بوتل پیٹ سے لگا رہے ہوتے۔ چپے کا رنگ زرد ہو جاتا چھویر لٹے جاتے اور لکھتے جاتے سناہے کہ بارہ بجے تک جس دن اتیقل ہوا ہے کام کرتے رہے خود نہ کھائے مگر کھواتے رہے اور جب دفتر سے مخلص ٹاپ کر کے چیرا سی گھر پر لایا تو اب ہمیشہ کہنے خاموش ہو چکے تھے بس یوں سمجھتے تھے جیسے جیسے مرض میں شدت ہوتی تو کام میں بھی شدت پیدا کر دیتے ہم لوگ روکتے تو کہتے کہ کام کرتا ہوں اس لئے مرض کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں قلم نہ ہوتا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔ ڈاکٹر مل کا خیال تھا کہ آپریشن پھر ہونا چاہیئے لیکن مسلسل بیماری نے مالی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا امر لانا آزاد مرحوم نے آپریشن کھانے میں پس پشیمانی کی وجہ کو تاڑ لیا اور اخراجات کی پوری ذمہ داری لی اور اباد علی کے شرمگاہ میں داخل ہو لئے میرے پاس تار آیا کہ فوراً آؤ تمہارے قریبی بعد آپریشن کی تاریخ مقرر ہوگی خیر میں بھی پہنچ گئی اور آپا بھی آگئیں لیکن ان کی حالت غیر تھی معلوم ہوتا تھا کہ آپا کا ہی آپریشن ہونے والا ہے ابانے آپا کی پریشانی کا اندازہ صورت دیکھ کر ہی لگایا اور تسلی دینے لگے جیسے واقعی آپا کا آپریشن ہو رہا ہو کہنے لگے ”دبھی بالکل معمولی آپریشن ہے ڈاکٹر کہتے ہیں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے صرف آدھے گھنٹے کا آپریشن ہوگا“ ابابا اپنی بہاری میں جتنے مضبوط تھے اپنے بچوں کے معاملہ میں اتنے ہی بودے اور کمزور۔ بچوں کو انکسشن بھی لگتا تو گھر سے باہر چلے جاتے لیکن اپنے آپریشن کے روز بے حد مطمئن تھے۔ ڈاکٹر مل کا کہنا تھا کہ اس عمر میں اور اتنے بڑے آپریشن کھلے اتنا باہمت مریض ہم نے نہیں دیکھا پریشانی سے اکثر نبض اور دل کی حرکت دونوں متاثر ہوتی ہیں لیکن قاضی صاحب کا دل اور نبض دونوں نارمل ہیں جس وقت پیسوں کا پلنگ ان کو لینے آیا تو خود ہی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے لگے ”لیجئے جناب ہماری سواری آگئی ہم چلے ہیں اور پلنگ

برلیٹ گئے۔ اس آپریشن کے بعد بابا کو کئی دن ہوش نہ آیا ہم لوگ آؤ مائول ہو چکے تھے لیکن ابھی زندگی باقی تھی بہتر نہ تھا مگر جو سوئے بات چیت کرنے لگے کچھ ٹپنے اطراف کے ماحول سے دلچسپی لینا شروع کی۔ ایک دن قریب سے کسی مریض کے کمر اپنے کی آواز آئی تو کہنے لگے ”تم لوگ اس مریض کی آواز سے اس کا حلیہ بتا سکتے ہو۔ میں نے کہا ہم لوگ تو اس کو دیکھ چکے ہیں۔ آپ بتائیے۔ تو یقیناً، مانئے اس مریض کا رنگ اس کی جسامت، اس کا قد اس کی عمر سب ہی کچھ بابا نے بتا دالا ہم لوگ تو حیران رہ گئے تھے لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ آواز سے حلیہ چھپانے والے بابا کبھی درست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکے ہر شخص کو سچا اور قابل بھروسہ سمجھ لیتے اور جب مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تو بڑی حسرت سے کہتے نہ آخر انسان ایسا بھول ہوتا ہے؟ بابا چلے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے گاڑی بھی وہی رفتار تھی لیکن آپریشن کا میاب نہ ہوا کینسر نے سارے جسم پر قبضہ جمالیا تھا انہر صاف ظاہر تھا کہ شمع گل ہونے کو سپد بابا نے تو اس بات کو بہت پہلے غصوں کر لیا تھا چنانچہ جب وہ آخری بار حیدر آباد آئے ہوئے تھے تو ایک دن میں باوجود کوشش کے سارا دن انکے کمرے میں نہ جاسکی ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ شام کو گئی تو مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے ”آج صبح سے کہاں غائب تھی؟ دیکھ جو وقت بابا کے ساتھ گذرتی ہے اسے غنیمت سمجھ ورنہ جب بابا نہ ہونگے تو پچھتائے گی کہ تھوڑی دیر بابا کے پاس بیٹھی بھی نہیں۔“ اور بابا کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ دسمبر میں حیدر آباد آتے وقت جب ان سے رخصت ہوئی تو کہنے لگے جاؤ بیٹی اب تو تم ہماری خبری سنو گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دن ہم بھی ہوش صاحب کی طرح چل دیں گے (ہوش بلگرامی کے انتقال کا ان کو بہت صدمہ تھا) بابا کی آنکھوں میں پہلی بار مایوسی کے آنسو تھے۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا لیکن آواز نہ نکل سکی۔ چند منٹ ان کو دیکھی رہی پھر خود ہی بولے

”اچھا اٹھی خدا حافظ ٹرین کا وقت بھی قریب آ رہا ہے اپنا قرن نہ روے وہ شاید کوئی وقت
 آپڑے“ میں دنگر صیدر آباد آگئی۔ گئے ہوئے شکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ عمار حضور ع
 ۱۹۵۰ء کی شام کو مجھے تار ملا کہ آبا رخصت ہو گئے دوسری دن میں مٹی گڈھ کیلئے روانہ
 ہو گئی وہاں پہنچی تو آبا کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی بس ابانہ تھے کسی گوشے سے بھی ان کے
 آواز نہ آئی ہزارا رہنے پر بھی جواب نہ ملا۔ ورنہ ان کی تو جیسے عادت سی پڑ گئی تھی کہ
 جب میں حیدر آباد سے جاتی تو سلام نہ دعا دیکھتے ہی کھینچتے تھے آپ کیوں تشریف لاتی ہیں کس
 نے بلایا ہے آپ کو؟ اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا ہے کہ منہ اٹھائے چلی آتی ہیں“ اور میں بھی
 بنیادی غصے سے قریب رکھا آٹنہ سامنے کر کے کبھی ”دیکھا ہے میرے باپ کو؟ ہر بات
 میں میرے باپ کا نام نہ لیا کیجئے“ لیکن اس دن میں نے سوچا کہ واقعی میں یہاں
 کیوں آگئی۔ یہ تو میرے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بغیر باپ کے گھر کیسے ہو سکتا ہے !
 لیکن یہ چند لمحے ہی بیت گئے اور بقول آبا کے :-

وہ دور بہاراں بیت گیا رواد جوانی ختم ہوئی
 انہوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

★ ”جو ضرورت خواہشوں سے پیدا ہوتی ہے وہ ضرورت نہیں ہے“ حرص ہے !
 ★ ”ضمیر ایک دوست کی طرح متنبہ کرتا ہے“
 ★ ”اور ایک عدالت کی طرح سزا دیتا ہے“
 ★ ”انسان کا ضمیر خدا کی آواز ہے“
 (قاضی محمد عبدالغفار)

مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میرے دن کا آرام اور رات کی نیندیں حرام کر دیں اور مقررہ پروگرام سے دوہیتے پہلے ہی والیں آگئے اور اس طرح سناٹے کے اسٹیشن پر پیارے آباد والوں نے مجھے اگلے ٹولے کر دیا مجھے لکیری مرابا آباد پہنچے۔ دیکھئے باوجود کوشش کے جی میں اس کہانی سے اسی کہانی الگ نہ کر سکی۔

ماموں میاں بے حد اعلیٰ انسان تھے۔ لیکن انکا اصول کسی کے لئے وبال جان نہ تھا اصول اور وقت کی پابندی کی وجہ سے انکے گھر کے اندر اور باہر کے تمام کاموں پر مشین کی طرح انجام پاتے نفاست پر اچھے کہ انکو دیکھ کر ایماء معلوم ہوتا کہ بس دھڑ دھڑانے رکھیں مجھے بھی بڑے حسین یالم از کم مجھے تو ان سے زیادہ کوئی حسین نظر میں آیا۔ علانیہ انکیس اونچی ناک جھوٹا سادہ بانہ خاوش بھی بیٹھے تو معلوم ہوتا مسکرا رہے ہیں، پھر ابھر اجسم سرخ سفید رنگ، گرمیوں میں جین کا، انگرکھا پہنتے۔ سوٹ پہنتے تو انگریز اور ہندوستانی کی تمیز مشکل ہو جاتی۔ بات چیت کا انداز نرم و شیریں، غصہ بھی کرتے تو میٹھا میٹھا، کھانے پینے اور نشست برخاست میں آداب کو ملحوظ رکھتے۔ بزرگوں کے سامنے شیعہ دانی اور ٹوپی بغیر نہ جاتے انکے سامنے پاؤں پر پاؤں رکھ کر نہ بیٹھتے۔

کھانا بڑی نفاست اور اسلامی اصول سے کھاتے شروع کرتے بسم اللہ سے اور ختم کرتے دعا پڑھ کر، چپاتی کا پہلا نوالہ ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے توڑتے۔ سالن نکالنے میں اگر میرے ہاتھ سے دسترخوان پر ٹپکا جاتا تو بڑی خوبصورتی سے دھبہ دکھا کر کہتے دیکھئے جناب یہ آپ نے لیا کر دیا، میں شرمندہ ہو جاتی اور آئندہ احتیاط برتنی۔

گھر میں بیوی بچہ نہ ہونے کی وجہ سے سارا کاروبار نوکروں کے ہاتھ میں تھا لیکن ہر کام اتنا وقت اور قاعدے سے ہوتا کہ کیا کوئی گھر والی کرتی۔ نوکروں کے ساتھ انکا برتاؤ غیر معمولی نرم و ملازم پرانے تھے کچھ انکے ساتھ کھیلے ہوئے کچھ انکے سامنے کے بچے، ماموں میاں جہاں مانتے یہ ملازم معہ خاندان انکے ساتھ ہوتے نوکر کو حکم دیتے تو لہجہ میں لجاوت آجاتی تھی

کا وقت آتا تو کہتے ”کیوں بھئی محمد علی جہو کو کھانا دو گے؟“ گویا ان کا آب و دانہ محمد علی کے ہاتھ میں ہو محمد علی بچپن کے ساتھی تھے لہذا ان کا دماغ بھی ذرا اونچا تھا مالک کی ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے اور ماموں میاں کو انھیں منانے کے لئے بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ اگر کبھی کہتے کہ بھئی محمد علی آج بجاری شیر وانی پر استری نہیں ہوئی بس محمد علی خفا ہو جاتے۔ ماموں میاں کا کام کرنا چھوڑ دیتے سامنا بھی نہ کرتے اور چھوٹے لڑکے ابن کو اپنی جگہ لگا دیتے وہ میرے ساتھ کا کھیلنا ہوا تھا۔ صبح پانچ بجے سے ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی مجھے سنا جاتا ”فاطمہ بی بی ہمارے آبا تو ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے جھلاتا یہ سرکار کی ذرا سی بات پہ گھر جاتے ہیں میرے خیال میں تو کام سے بچنے کا بہانا، ہوتا ہے اور بیماری شامت آجاتی ہے۔ یہ لڑائی دو دن سے زیادہ نہ رہتی نہ کاری محمد علی کو بلاتے اور کسی دعوت کے متعلق اس طرح مشورہ لیتے گویا محمد علی کی رائے کی جبرائیت ہے۔ کسی کو نہیں ہے اور اس طرح پھر دوستی ہو جاتی۔

اپنا کئی کام ماموں میاں ہاتھ سے نہ کرتے تھے جام اگر خط بناتا تو کمرنگھی کرتا عطر لگا جوتا پہناتا اس معاملہ میں وہ بالکل بچوں جیسے تھے اپنے ہاتھ سے اگر کبھی لنگھی کسوتے تو ایک کی آگے کئی کئی مانگیں نکل جاتیں عطر ضرور لگاتے خود لگاتے تو معلوم ہوتا کپڑوں پر سالن ٹپکا لیا ہے۔ گھر والے اگر کہہ دیتے کہ آج معلوم ہوتا ہے آپ نے اپنے ہاتھ سے عطر لگایا تو معصوم سی ہنسی منہ دیتے۔ ملازمین کے شادی و غم میں برابر کے شریک رہتے، نوکر کی شادی میں شرکت کرنا ہے تو بڑی سے بڑی دعوت سے بھی یہ بکسر معذرت کر لیتے کہ آج میرے ملازم کی شادی ہے۔ مجھے ملازمین کا نام لینے کی اجازت نہ تھی۔ سب ملازم مرد تھے لیکن میں کسی کو کالی اماں کسی کو گوری اماں اور کسی کو جانی اماں کہتی تھی۔ اگر کوئی نوکر مجھے آواز دیتا اور میں جواب میں ہوں کہ ہمتی تو فوراً ٹوکتے ”جناب“ یہ ”ہوں“ کیا چیز ہوتی ہے؟ میں ان سب سے آپ جناب سے ہی بات کرتی تھی۔ محمد علی کے علاوہ جان محمد اور سلامت انکو بہت عزیز تھے۔ سلامت کو ڈاکٹر نے دق کا شہ بہایا تو ایسے ساتھ ولایت لیکر گئے تاکہ بہتر علاج ہو سکے۔ جان محمد کا انتقال

ہوا تو دلی سے کار کے ذریعہ سمیت میں شریک ہونے آئے اسکی بیوہ (جو کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھی) کی شادی اپنے ایک ملازم نعمت سے کردی لیکن بچوں کے اخراجات کے لئے ماہانہ مقرر کر دیا اور جب لڑکیاں شادی کے قابل ہوئیں تو آپا کو خاص طور پر انکی شادی کے انتظامات کے لئے بلایا اور بڑے ٹھاٹ کی شادی کی جہیز ایسا جوڑا کہ کیا کوئی عورت کرتی کوئی ایسی ضرورت کی چیز نہ تھی جو جہیز اور بری میں شامل نہ ہو۔ جان محمد کے بچوں کے ساتھ یہ سلوک اس خدمت کا صلہ تھا جو انھوں نے ماموں میاں کی سخت بیماری میں کی تھی۔

ماموں میاں بہت ہی اچھا غذا کھاتے تھے انکا کھانا بدھن پکاتے تھے انتقال سے چند مہینے پہلے غذا بالکل چھوٹ گئی تھی صرف چھانچھ پر گزارا کرتے تھے بدھن نے کہا کہ آپکی غذا تو کچھ ہی نہیں میں بھی بڑھا ہو گیا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو سراد آباد چلا جاؤں کہنے لگے "جی بدھن ساری زندگی ہمارے ساتھ گذاری اب ہماری چار دن کی زندگی میں کیوں ساتھ چھوڑ دیتے ہو۔ بدھن نے ارادہ ملتوی کر دیا وقت کی بات ہوتی ہے کہ اس گفتگو کے چار دن بعد ماموں میاں چل بسے بدھن ہی کہہ کر دھاڑیں مار رہے تھے کہ سرکار اتنے زباں کے پتے ہونگے میں نے سوچا بھلا نہ تھا۔

جس کا سلوک ملازمین کے ساتھ ایسا ہو سوچئے خاندان اور احباب کے ساتھ کیا رہا ہو گا۔ خاندان کے ہر چھوٹے بڑے سے انکے تعلقات یکساں تھے امیر غریب کی اصطلاحوں میں تو شاید وہ سوچنا جانتے ہی نہ تھے۔ خاندان میں کسی پر میرا وقت پڑتا تو نہ بچوں کو یتیمی کا احساس ہونے دیتے نہ بیوہ کو گندہ بسر کے لئے چادر سر پر ڈال کر باہر نکلتا پڑتا ان تمام باتوں کے لئے ماموں میاں اپنی ذمہ داری سمجھتے خاندان میں انکو سر پرست کا مقام حاصل تھا۔

مدد کرتے تو اس طرح جیسے انکا فرض ہے اور لینا والا اس طرح لیتا گویا ماموں میاں پر بڑا احسان کر رہا ہے۔ ان کے ایک چچا تھے اللہ معاف کرے انکی جائیدادیں سے مردوں کے مال سے اضافہ ہوتا تھا کہنے کو عالم فاضل تھے حلیہ ایسا کہ اچھے اچھے عابد و زاہد انکے سامنے آتی تھیں۔

اپنے کو مذہب کا ٹھیکہ دار سمجھتے تھے۔ حدیث بغل میں دلی رشتی خاندان کا کوئی کلا ولد مہتر تو نہ بلکہ
 کہ شرف کی رو سے انکا حصہ ضرور نکل آتا۔ یہ سگے چچا بھی نہ تھے ہمارے نانا کہ چچا زاد بھائی
 تھے۔ ماموں میاں ان کا بے حد احترام کرتے تھے جب ماموں میاں کے قلب پر حملہ ہوا تو ڈاکٹر
 کوئی دن انکی زندگی سے مایوس رہے چچا ابا کی مراد بر آئی یہ بھوپاں کے فاضلی تھے۔ فوراً کاغذات
 لیکر پہنچے اور کہنے لگے مد یعقوب تمہاری زندگی کا بھروسہ نہیں بہتر ہو گا کہ تم جاؤ اور مرنے میاں
 (انکے بیٹے) کے نام کرو ماموں میاں نے کمزور آواز میں جواب دیا ”چچا ابا ابھی تو میں زندہ
 ہوں“ اور ابا خاموش ہو گئے ابا یعنی میرے خالو اور بھائی وہاں موجود تھے اس گفتگو سے
 بہرہم ہو گئے اور ڈاکٹروں سے کہہ کر وارڈ کے باہر کر دیا۔ اسکے باوجود ماموں میاں جب تک
 زندہ رہے انکی عزت اور احترام میں فرق نہ آنے دیا۔ اور جب ماموں میاں کا انتقال ہوا تو
 چچا ابا نے میہ والد کو پیر سے کا تارا اس طرح دیا۔

”دہت افسوس ہوا یہ قیام کا انتقال ہو گیا امید ہے انکا سامان میرے لئے محفوظ کر لیا
 ہوگا“ دنیا الیہ سنگدلوں سے خالی نہیں ہے

ماموں میاں جہاں جاتے عزیزوں دوستوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے حیدر آباد آئے تو یہاں
 بھی کچھ دوست اور دوستوں کے رشتے دار مل گئے۔ انکو پتہ چلا کہ کسی صاحب کی بیوہ بھی یہاں
 رہتی ہیں جو مراد آباد میں انکے محلدار تھے کسی طرح پتہ چلا کہ ان کے یہاں پہنچنے گلیوں میں مکان
 تھا موٹر نہ جاسکتی تھی تو پیدل جا کر ان سے ملتے جس کا ان بڑی بی کے دل پر بڑا اثر ہوا۔
 موٹر بھیج کر اپنے یہاں بلاتے ہی تھے، جب ہم سے ملیں تو کہتیں اتنا بڑا آدمی مجھ غریب کے
 گھر آتا ہے محلے والے مجھے عزت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔

دوست احباب کی کوئی گنتی نہ تھی نہ جانے کون واقعی دوست تھا اور کون ملاقاتی۔
 میں نے سجاد حیدر بلوچ، سہ رضا علی خواجہ حسن نظامی کو قریب سے دیکھا ہے عجیب اتفاق ہے
 کہ ماموں میاں ان تینوں کے سامنے گئے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا سر طالب علم ان کا دوست تھا چھوٹا ہویا بڑا۔ یہاں آئے تو پنجتن چچی اور آغا چچا کے ساتھ ان کا وہی سلوک تھا جو ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔ آغا میر حسن جو کہ آپا میر کے نام سے مضامین لکھتے تھے تو ماموں میاں نے بھی ہمیشہ آپا میر ہی سے مخاطب کیا دور سے دیکھتے ہی کہتے آؤ جی آپا میر۔

دوست احباب کے معاملے میں کبھی سیاسی اختلافات کو ذاتی تعلقات کے درمیان نہ آنے دیا۔ ایک مرتبہ جب خلافت تحریک دوروں پر تھی مولانا شوکت علی مراد آباد آئے اور ایک مسجد میں مجمع کو خطاب کیا جوش میں آکر ماموں میاں پر بھی اعتراضات شروع کر دیئے چند منٹ تو مجمع خاموش رہا پھر مولانا پر جوتوں، اور پتھروں کی بارش کر دی اور مراد آباد چھوڑ دو کے نعرے لگنے لگے۔ مراد آباد والے ماموں میاں پر جان پھڑکتے تھے وہ بھلا کاسے کو گالیاں ابرداشت کرتے!!

بات ماموں میاں تک پہنچنا ضرور تھا۔ رات کو انھیں کھانے پر مدعو کیا اور انکے ساتھ مسجد میں جو سلوک ہوا اسی معافی چاہی مولانا نے ماموں میاں کو گلے لگایا کہنے لگے ”یعقوب میں نے تم کو پہچانا نہیں مجھ کو معافی کر دو“ ماموں میاں نے کہا ”ہمارے سیاسی میدان الگ ہیں جو کچھ تم نے کہا وقت کا تقاضا تھا۔ اس کا اثر ہمارے ذاتی تعلقات پر نہیں پڑنا چاہیے۔“

اب کہاں ہیں ایسے لوگ ماموں میاں اور مولانا شوکت علی کی عظمت کا قابل ہونا پڑتا ہے۔

آج کل کون گالیاں دیکر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور کون گالیاں سن کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا۔

کبھی صحیح تعداد کا پتہ نہ چلا کہ کتنوں کو تعلیم دلوائی کتنوں کو نوکریاں۔ ویسے ہفتہ میں دو دن فقرا میں خیرات تقسیم ہوتی ہر دیوں میں رضائیاں تقسیم کی جاتیں۔ مذہبی انسان تھے سگریٹ حقہ ہوشربا کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ انگریزوں کی دعوئوں میں میسر شربوں سے بھری رہتی پیتے کا دور شروع ہوتا تو گھر کے زنانے حصے میں آکر مہلوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ روزہ پابندی سے کہتے تھے انتقال سے چند ماہ پہلے صحت بہت بگڑ گئی تھی اس سال روزہ نہ رکھ سکے لیکن، احترام اتنا تھا کہ روز دار نوکر کو کھانے کا میز پر نہ آنے دیتے کوئی روزے کے متعلق پوچھتا تو

الحمد للہ کہاریے۔ دعوتیں کرنے اور دعوتوں میں شریک ہونے کا بہت شوق تھا آخری زمانے میں جب غذا بالکل چھوٹ گئی تھی دعوتوں میں اپنے چھاپہ کے گلاس کے ساتھ شرکت ضرور کرتے۔ مہمانوں کا آنا باعثِ رحمت سمجھتے تھے گھر بھی مہمانوں سے خالی نہ دیکھا انکے نوکروں نے تو گھر کا نام ہی یعقوب ہوٹل رکھ دیا تھا۔

سفرِ شیشی کرنے میں پیش پیش رہنے کا شوق انہوں نے ہر ایک کو اپنا دوست یا عزیز لکھ دیتے چاہے وہ دھوبلی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے خالہ زاد بھائی سے انکو بڑی امید تھیں وہ سمجھتے تھے کہ انکے دم سے ماموں کا گھر جیش آباد رہیگا، مگر افسوس دیکھتے ہی دیکھتے جوان بھانجا ختم ہو گیا بھائی کی موت نے ماموں میاں کو زبردہ درگور کر دیا بھائی کے انتقال کے پانچ ماہ بعد ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء کی سہ پہر کو اچانک رخت ہو گئے۔

ہملوگ چند دن کے لئے والد کے یہاں حمایت نگر گئے ہوئے تھے صبح کو فون پر بات کی اور اصرار کیا ہملوگ آجائیں چونکہ رات کو کہیں کھانے پر جاتا تھا اس لئے دوسرے دن صبح جانا طے پایا تھا لیکن اسی دن ۳ بجے دوپہر کو نوکر کا فون آیا کہ سرکار ختم ہو گئے وہاں پہنچے تو کچھ بھی نہ پایا پیارے بابا کی چیخ نکل گئی کہنے لگے ”یعقوب آج میرے دونوں بازو جھڑ گئے۔ انتقال کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضور نظام تشریف لائے بہت روئے نوکروں پر گرے جے برے بھی! اور کہا یہ نہ سمجھنا کہ یعقوب یہاں اکیلے تھے اگر ذرا بھی موت کی وجہ میں شبع ہوا تو جان کی خیر نہ ہوگی ماموں میاں کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھی رندھی ہوئی آواز میں کہا ”یعقوب میں نے تو تمہیں ۳ سال کے لئے بلایا تھا لیکن تم نے دو سال بھی پورے نہ کیے“

ماموں میاں کی خواہش تھی کہ انکو اپنے شہر کی مٹی ملے لیکن اعلیٰ حضرت نے کہا وہ میرے مہمان تھے میں اپنے ہی پاس رکھنا چاہتا ہوں چنانچہ ”خطِ صلیب“ میں سپردِ خاک کر دئے۔

غریب الوطنی میں موت آئی اور ہم تنہا رہ گئے لیکن جس طرح بیگم امیر حسن اور ڈاکٹر و مسنر
حیدر علی خاں نے ہمارا ساتھ دیا اور دای حضرت یعنی آغا چچا کی والدہ نے جس طریقہ سے ہمارے
دلوں کو سنبھالا اور غم برداشت کرنے کے قابل بنایا اس کو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔
اعلیٰ حضرت نے مجھ پر تکفین کی پوری ذمہ داری لی اور جس شان سے ماموں میاں نے زندگی گزاری
اسی آن ہو بان سے رخصت ہوئے اللہ جوار رحمت میں جگہ سکنا بظاہر زندگی کا بہر آرام اور سکون میسر ہے
لیکن دل کچھ چکا۔

ماموں میاں نے بے ماں ہونے کا احساس ہی مٹا دیا تھا لیکن انکی موت نے پہلی بار ماں کا
غم دیا اور معلوم ہوا جیسے ماں آج ہی سری ہیں۔

انکے دوست احباب نے بھی ہماری ہی طرح ماتم کیا۔ سجاد حیدر بلدرم نے پیارے ابا کو
پڑے میں لکھا ”تمہیں تعزیت نامہ کیا لکھوں جدم دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور
ووستوں کو بھڑکرا چلے جانے والے کے نام پیام بھی سر یعقوب کی قوم پرستی نہیں احباب پرستی
کی یاد تڑپا رہی ہے۔“

اپنے جدم دیرینہ کے نام پیام میں کہتے ہیں۔
اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے
یہ شرط رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم

مضبوط پکڑتے تھے سر رشتہ الفت
یہ کیا کہ جھٹک کر اسے خود توڑ گئے تم

اے عالم فانی سے نظر پھینے والے
بے کوئی کنکشن تجھ کو یہاں پھر سے جو لائے

وہ ڈوب گیا جس نے ہزاروں کو ابھارا
کس کس کو دیا ہمت عالمی سے سہارا

یعقوب سب کوئی نہ آئیگا دوبارا
شیریں سخن و دوست نواز انجمن آرا

وہ جو کے لٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکرِ اخلاص و تمثالِ محبت

احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے
احباب فراموش کو شرماء تو آکر

یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلاؤ
اس طعنہء دل دوز کو جھٹلاؤ تو آکر

آرام سے زیرِ لحد جا کے ہو لیٹے
اپنے کو بچائے ہوئے دامن کو سمیٹے

بیکار رہے بیکار رہے اخلاص و محبت
اب کوئی نہ ہوگا مزاجِ جادہء آفتاب

وہ مدعی رہبرؑ راہ محبتؑ
کہتا تھا زمانہ کہ وفا اس کی ہے خصلت

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

چچا سجاد حیدر نے تو اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا
مگر میں وہ تربان کہاں سے لاؤں جو میرے ماموں میاں کا ماتم کر سکے ۔

کتبہ لوح مزار

مادہ تاریخ رحلت مولوی سر محمد یعقوبؒ، مشیر اصلاحات فرمودہ حضرت
بندگان اقدس آصف سابع۔

گفت گھلے چمن حیف صباؑ رفتہ
بوئے نسیم و نسیم ہم نہ بولے رفتہ
گفت عثمان بدکنؑ ایں چہ نصیب یعقوبؒ
اے زہے موت کہ ناگاہ بہ جائے رفتہ

۱۳۶۱ھ

(بمعنی خطہ صالحین)



شاہد بھائی

۱۰۵ شاہد بھائی کمال کر دیا آپ نے! اللہ سے نازک دماغی درد سر کا بہانا لکھا اور چلتے بنے آخر شاعر تھے نا۔ جوابات کی خدا کی قسم لا جواب کی۔ بہانہ بھی کیا تو شاعر نہ کیا۔ تو آج کا واقعہ بڑا عجیب رہا۔ خلاف معمول لیٹے ہی لیٹے میں نے اخبار کے متعلق پوچھا ”ماں آگیا شاہد صدیقی ختم کئے۔ میں نے پوچھا کون شاہد صدیقی۔ یقین مانئے شاہد بھائی میں سمجھی عالم علی صاحب کے کوئی ملنے والے ہونگے۔ میرے سوال پر انھوں نے حیران ہو کر کہا ”کون سے کیا مطلب؟ شاہد صدیقی ایک ہی تو تھے!!“

اور میں ہڑ بڑا کراٹھ بیٹھی اخبار میں آپ کی تصویر کے ساتھ آپ کے انتقال کی خبر تھی واقعی شاہد صدیقی صرف حیدر آباد ہی نہیں بلکہ ہندوپاک میں بھی ایک ہی تھے اور میں رونے لگی۔ میری خود سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیوں رو رہی ہوں بالکل اسی طرح رو رہی تھی جیسے کوئی بہن بھائی کے لئے روتی ہے۔ اس وقت میں یہ بھول گئی تھی کہ آپ شاعر ہیں، ادیب ہیں یا صحافی ہیں مجھے صرف یہ خیال تھا کہ کتا اچھا کتا بلند انسان مر گیا، ایک شوہر مر گیا، ایک بھائی مر گیا، میں روتی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ سب رو رہے ہیں۔ پھر شاہد بھائی بغیر جانے پہچانے میں زینت آپا کے ساتھ آپ کے گھر پہنچ گئی۔ جلنے ہیں کیوں؟ آپ کی موت کی تصدیق، چاہنے کیلئے راستے بھر دعا کرتی رہی خدا کرے یہ منحوس خبر آپ کے دشمنوں نے اڑائی ہو۔ مگر نہیں بھائی آپ کا دشمن کوئی ہو ہی کیسے سکتا تھا، لیکن سنیئے آپ کا ایک دشمن تھا جس نے آپ کو سوچ سوچ مار ڈالا تھا اور وہ تھا ہمارا سماج۔ آپ کیا جانیں شاہد بھائی آپ کے گھر میں ایک کھرام برپا تھا اور اس ہنگامہ میں آپ ایک نیا جوڑا پہنے آرام کی نیند لے رہے تھے معلوم ہوتا تھا برسوں کا تھکا مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر سودگی کی نیند سو رہا ہے۔

میں پہلی بار آپ کے گھر آئی تھی آپ نے اپنے مخصوص انداز میں نہ تو سلام کیا نہ ہی مزاج پوچھا ،
آخر شاعر جو ٹھہرے جی چاہا کیا نہ جی چاہا تو کس کی مجال کہ جو سلام کر لے میں نے بھابی
کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ آٹھ دن کی دہن تھیں اور آج سولہ سال بعد دیکھا تو ان کا
سہاگ سوچ کا تھا ان کا سگھرا تر چکا تھا میں نے آپ کے گھر پر نظر ڈالی اللہ اکبر! سفدر شاد مار
مکان ہے۔ اسکے دو کمرے ایک دالان کھیریل کی چھت کچی مٹی بوسیدہ دیواریں ، بجلی نڈارد
میز کرسی تو دور کی بات ہے۔ یہ ایک بہت بڑے شاعر ایک عظیم انسان کا گھر تھا۔ پھر میں نے
آپ کو دیکھا قربان جائے اس قناعت پر اور خود داری پر سچ کہتی ہوں شاید بھائی۔ آپ کی
باتیں جینے کی نہ تھیں جینے کے لئے حرمیں وہوں چاہیے۔ دولت کے انبار چاہیے، نام نمود
چلیے۔ آپ کے نزدیک یہ سب بہت گھٹیا چیزیں تھیں۔

آپ ان سے بالاتر اور بے نیاز تھے اور یہ سب باتیں جینے کی نہیں ہوا کرتیں۔ اللہ کو
اس بے نیازی پر پیارا لگیا اور آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے اطراف گھر والے جمع تھے
اور میں دیوار کا سہارا لئے کچھ دور کھڑی تھی سینما کی تصویروں کی طرح نہ جانے کتنے سین
آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔

کہیں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ شعر سن رہے ہیں سنتے والے جھوم رہے ہیں کہیں جلسہ
ہے آپ مضمون پڑھ رہے ہیں سارا پینڈال زعفران زار بنا ہوا ہے کہیں مجمع کو قابو میں
کرنے کے لئے مائیک کے سامنے کھڑے پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ یہ لیجئے پان کھا رہے
ہیں اب چائے کی پیالی ہاتھ میں ہے لے لیجئے ابا کے سامنے یوں سعادتمند بنے
بیٹھے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں بیچارے!!

اور پھر بیماری سے اُٹھتے ہی ہسپتال سے سیدھے بنجارہ ملز آئے ہیں لاہوٹی صاحب
کا سہارا لئے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں آپ ایسی حالت میں کیوں آئے
تو کہتے یہاں میں رہتی ہوں طبیعت سنبھل جاتی تو آجاتے اس وقت زحمت کموں

کی، لیجئے آپ تو مرنے لگے اور اتنا روئے کہ میرا جی چاہا ابا کی موت کا پیرسہ آپ ہی کو
 دوں۔ اور پھر ایک بار دوپہر کو میرے یہاں آپ کھاتے پر آئے آپ کے کئی ساتھی بھی وہاں
 موجود تھے کئی آغلی کے اعتراض میں یہ دعوت تھی میں آپ کی ہلکی باتوں کو سُنتی اور لطف
 اٹھاتی رہی پھر آپ لوگ رخصت ہونے لگے گیٹ کے پاس ایک بڑی لمبی گاڑی آپ لوگوں
 کے لئے تیار کھڑی تھی گاڑی کی جسامت پر تبصرہ ہوئی رہا تھا کہ آپ تیسری سے دونوں،
 ہاتھوں سب کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے آگے نکل گئے پھر پیچھے پلٹ کر بولے بھی میں
 آگے بیٹھوں گا تا کہ جلدی گھر پہنچ جاؤں آپ کی اس بے ساختگی پر سب ہنس پڑے اور
 میں کئی دن تک ان باتوں کا لطف اٹھاتی رہی۔

اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا لوگ آپ کو اتار دیا تھا۔ لے رہے تھے طاہرہ
 بھابی سے کوئی مہر معاف کرنے کے متعلق کہہ رہا تھا اور انھوں نے آنسوؤں اور آہوں کے
 درمیان کہا وہ تو پہلے ہی دے چکے، کتنے مہان تھے آپ۔!

آج شاہد کے لئے دنیا رو رہی ہے دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں۔ تعزیتی جلسے
 اور قراردادیں منظور کی جا رہی ہیں لیکن میں پوچھتی ہوں جو زندگی بھر زندگی کے لئے ترستا
 رہا جو دل کے ناسوروں میں ظرافت کا رنگ بھرتا رہا اس وقت یہ سب لوگ کہاں تھے؟
 اس وقت تو یہ فکر تھی کہ شاعرہ کی کامیابی کے لئے شاہد صدیقی بہت ضروری ہے مجمع کو قابو میں
 کرنے کیلئے شاہد کو مائیک سنبھالنا چاہیے۔ فلاں ادیب کی موت پر شاید سے بہتر کوئی نہیں لکھ
 سکتا شاہد کی ظرافت کی چاشنی فلاں اخبار کی کامیابی کی ضامن ہے۔

شاہد ہر جگہ ضروری تھا لیکن اسکو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ آرام کی، اسٹش کی
 نیند کی، تفریح کی وہ ہر چیز سے محروم تھا۔ اور آج آپ اپنے اخبار کے لئے اپنے
 رسالے کے لئے یہاں مواد جمع کرنے آئے ہیں۔ وہ کیسے گھر میں رہتا تھا، وہ کیا کھاتا
 تھا۔ اسکی کیا عادتیں تھیں، وہ کس طرح لکھتا تھا، اسکے سوچنے کا ڈھنگ کیا تھا۔

شاہد کی نئی زندگی آج پڑھنے والوں کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کر رہی ہے
 اس سے بڑھ کر ہمارا اور کیا مذاق اڑایا جاسکتا ہے۔ تو شاہد بھائی آپ ہی بتائیے
 اس میں سے ہم بھابی کے کس سوال کو جھٹلا سکتے ہیں۔
 ہمارے پاس سوئے شرمندگی کے کوئی جواب نہیں آج شرمندگی پہ پچھتاوا ہے
 مگر لا حاصل۔ پچھتاوے کیا بہت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔!



شاہد صدیقی

آدمی کی نظروں میں اک نیا آجالا ہے • آدمی اندھیدوں پر ففتح پانے والا ہے

زندگی کے ملک ہم زندگی کے خالق ہم • ہم نے اپنے سانچوں میں زندگی کو ڈھالا ہے

جو چھپا کے رکھی ہے لادہ ساری مٹے ساتی • ورنہ آج رندوں کو ہوش آنے والا ہے

دو نہ صبح کا دھوکہ لوگ خود سمجھتے ہیں • کس قدر اندھیرا تھا کس قدر آجالا ہے

رات کے گذرتے ہی اور ایک رات آئی

آپ تو یہ کہتے تھے دن نکلنے والا ہے

ڈنڈا صاحب بیمار کی یادوں میں

شاہد صدیقی نے صریحاً فریب دیا۔ سن گن تک نہ دی اور رحلت فرما گئے۔ ان پر غصہ تھا اور آج تک ہے۔ ابھی تک مشاعروں میں نظریں انھیں کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ ڈنڈا صاحب رخصت ہو گئے۔ انھوں نے جانے سے پہلے اعلان کر دیا تھا کہ ”دیکھو ہم جارہے ہیں پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی“ لیکن نہ جانے کیوں ہم اس اعلان کو بھی ان کا ایک مذاق ہی سمجھتے رہے انتقال سے آٹھ دن پہلے اخبار میں دیکھا کہ سرور ڈنڈا شدید بیمار ہیں لیکن یقین ماننے ذرا بھی توشہت کا احساس نہ ہوا بس یہی سوچا کہ بیمار ہونے کی ان کو عادت ہے اور جیب لپیٹے ہیں تو انداز شدید ہی اختیار کرتے ہیں اب کے بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا مذاق نے وحشت ناک سنجیدگی اختیار کر لی۔

مجھے ڈنڈا صاحب کی کیفیت برابر معلوم ہوتی رہی اور میں خود کو مجبور کرتی رہی وہاں جا کر ان کی عیادت کرنے کے لیے لیکن کامیاب نہ ہو سکی ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی پھر بھی میری ہمت نہ ہوئی سوچتی تھی اس قدر زندہ دل انسان کو کربا میں کیسے دیکھوں یہ میری کمزوری ہے اور بہت غلط قسم کی کمزوری ہے کہ میں مریض سے اس وقت دور بھاگتی ہوں جب واقعی اس کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے قریب ہوں بچنا بچہ میں ابھی اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی کہ ۲۰ نومبر کی شام کو مجھے فون سے اطلاع ملی کہ ڈنڈا صاحب جیل بسے میرے منہ سے بس ارے نکلا! میں اس خبر کے لیے تیار نہ تھی۔ نہ جانے کتنی رات گئے تک انھیں کے بارے میں سوچتی رہی رہ رہ کر یہ

خیال آتا تھا کہ چالیس سال کی عمر میں تو مرد جوان مرد ہو کر تباہ یہ عمر تو نچتہ عمر کہلاتی ہے اس عمر کو پہنچ کر ہی انسان اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ ہوتا ہے اور ڈنڈا صاحب سے ایسے ہی وقت حیات لے لی گئی آخر وجہ یہ کیا انہوں نے وہ سب وقت سے پہلے حاصل کر لیا جو ان کو اب کرنا تھا؟ ہو سکتا ہے اللہ کے بھید انسان سمجھنے سے قاصر ہے انسان کچھ سوچتا ہے اور ہوتا کچھ ہے ڈنڈا کی موت میں کیا مصلحت ہے اللہ بہتر جانے !!

سرور ڈنڈا محض شاعر ہی نہ تھے وہ فنکار بھی تھے انہوں نے فائن آرٹ کا لچ سے پنٹنگ اور کمز شیل آرٹ میں ڈلوما بھی لیا تھا۔ اس فن میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اگر بجائے شاعری کے مصوری کو اپناتے تو اس میں بھی اتنا ہی نام کھاتے جتنا کہ بحیثیت شاعر کے کیا ہے !

کمز شیل آرٹ کو کچھ دن معاش کا ذریعہ بھی بنایا لیکن شاید ڈنڈا کو فنون لطیفہ سے روزگار حاصل کرنا پسند نہ آیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر آرٹ تجارت کی منڈی میں آجائے تو پھر وہ آرٹ نہیں رہتا محض ٹھونس ٹھانس رہ جاتی ہے اس سرور ڈنڈا حقیقی معنوں میں آرٹسٹ تھے چنانچہ انھوں نے آرٹ کی لطافتوں کو اٹے وال کے بھاؤ فروخت کرنے کے بجائے ٹھیکہ داری شروع کر دی اور یہ کاروبار ان کے لئے بہت مہنگا ثابت ہوا ڈنڈا صحت کے اعتبار سے کبھی بھی تندرست نہ ہوا نہ تھے چھوٹی چھوٹی بیماریاں چلتی ہی رہتی تھیں ٹھیکہ داری کا بار ان کا جسم برداشت نہ کر سکا وہ تو ایک حساس فنکار تھے (فنکار کے لئے حساس ہونا پہلی شرط ہے) بھلا ٹھیکہ داری سے ان کو کیا منافع جب سابقہ پڑا جسم و جان دونوں جواب دے گئے۔

ڈنڈا کا کلام پڑھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہی کیوں کہ زبان کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر پاتی اس لئے میں اس کا کلام انھیں کی زبانی سننے کی مشتاق رہتی تھی۔ ایک مرتبہ کلام شائع کرنے کی بات چھڑی تو میں نے کہا خدا کیلئے ڈنڈا صاحب اپنا کلام آپ کتاب کی شکل میں کبھی نہ چھپوائیے گا کیوں کہ میں نہ پڑھ سکوں گی اور یوپی والے کلام کی ریڑھ لگا کر رکھ دیں گے میری رائے میں آپ اپنا کلام اپنی ہی زبانی ریکارڈ کیا کریں۔ ایک ریکارڈ بازار میں آجائے پھر تماشا دیکھئے کسی مانگ ہوتی ہے۔

میرے اس خیال پر اچھل ہی تو پڑے کہنے لگے ”کیا صحیح بات بولے فاطمہ صاحبہ چلے ریکارڈ کی بات“۔
 میں ڈنڈا صاحب کے ساتھیوں سے درخواست کروں گی کہ جہاں جہاں بھی ڈنڈا صاحب
 کی آواز ریکارڈ کی ہوئی ملے یکجا کر کے ریکارڈ کروا کر بازار میں لائیں تاکہ کتنی..... زبان کے
 عوامی شاعر کی آواز دکن کے باہر بھی سنی جاسکے۔

ڈنڈا صاحب پڑھنے کا انداز بڑا نرالا تھا جیسا انداز تھا ویسی ہی خوبصورت آواز بھی تھی۔ گردن
 کو ایک طرف جھکا کر جب وہ ترنم سے اپنا کلام سُنتے اور ہاتھوں سے ترنم کے اتار چڑھاؤ کو ظاہر
 کرتے تو کلام میں چار چاند لگ جاتے۔ ڈنڈا صاحب مشاعروں میں بہت کم آتے تھے میں نے اس کی
 وجہ پوچھی تو کہنے لگے ”کیا بولوں پاشاہ شاعر! میرے سے خفا ہو جائیں اس واسطے اپن دور اچھے
 اور بد واقعات سے کہ بڑے مشاعروں میں جب کہ ہندوستان بھڑکے مشہور شعراء جمع ہوتے عوام کی
 نظریں ڈنڈا کی متلاشی رہتیں ایک دوسرے سے پوچھتے ”یارو اپنا ڈنڈا بھی ہے کیلے۔“

اور اگر ڈنڈا نظر آجائے تو لوگ دوسرے شعراء کو زیادہ دیر صبر سے نہ سن سکتے ایک ہلڑچ جاتی
 پہلے درخواست کی جاتی جناب ڈنڈا صاحب سے سوائے اور جب درخواست بے اثر ہونے لگتی تو
 پبلک حکم صادر کرنے لگتی مختلف گوشوں سے مطالبہ شروع ہو جاتا ”ڈنڈا کو بلاؤ“ ”ڈنڈا اوانیڈ“ وغیرہ وغیرہ
 اور مجمع کو قابو کرنے کیلئے ڈنڈا صاحب لائے جاتے اس وقت ان کی عجیب کیفیت ہوتی: ایسا معلوم
 ہوتا جیسے مجرموں کے کھڑے میں لاکھڑا کیا ہو۔ فرمائشوں کی بوچھاڑ ہوتی ڈنڈا صاحب کی آواز باز رہا
 کی طرح گونجتی سامعین پر جادو سا ہو جاتا آخری شعر ختم کرتے کرتے بھاگ کھڑے ہوتے لیکن گرفتار
 کر لے جاتے ایک آدھ چیز سن کر ڈنڈا صاحب کو کبھی رہائی نہ ملی یہی وجہ تھی کہ ڈنڈا کو عام طور پر شاعروں
 میں سے نہیں سنوایا جاتا وہ اکثر صحت کی خرابی کا عذر بھی پیش کرتے لیکن عوام کے اشتیاق اور خلوص سے
 ڈنڈا آسنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہ سطرین لکھ رہی ہوں ڈنڈا صاحب کی آواز کانوں میں
 گونج رہی ہے اور میں سوچتی ہوں کہ انسان کس قدر کمزور ہے نہ ہی آج ڈنڈا صاحب کی آواز واپس بلا سکتی
 ہے اور نہ ہی ڈنڈا صاحب بولنے کو ٹال سکے۔ یہ ہے انسان کی حقیقت۔ !!

مخدوم صاحب چند خوشگوار یادیں

دیکھ رہے ہیں مخدوم صاحب آپ کی ستر صفوں سا لکڑہ منائی بجاری ہے
ہر مکتب خیال کے لوگ جمع ہیں نہ جانے کیوں بار بار دروازے کی طرف نظر میں اٹھ
رہی ہیں۔ شاید آپ ہی کا انتظار ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا انتظار۔ کاش !

اُسی اداسے اُسی بانچپن کے ساتھ آؤ

پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ

لیکن انہونی آرزو ہے کیسا نرالا انتظار ہے جس میں اذیت ہی اذیت ہے
اس اذیت کو کم کرنے کے لئے انسان کیا کیا جتن کرتا ہے کیسے کیسے بہانے تلاش
کرتا ہے ادویوں سمیٹے کہ آج کی یہ تقریب بھی ایسا ہی ایک بہانا ہے جس میں میں پہلی بار
قلمی حصہ لے رہی ہوں۔

لیجئے آپ تو ہنس رہے ہیں یہی سوچ کر ہنس رہے ہوں گے کہ ”انھیں دیکھو اور ہم
پر مضمون لکھنا دیکھو“ تو بھی یقین جانئے میں بالکل آپ سے متفق ہوں ملائے ہاتھ
اسی بات پر سچ تو یہ ہے کہ آپ پر قلم اٹھانے کی جسارت میں کبھی نہیں کرتی کیونکہ آپ پر
کچھ لکھنا میرے بس کاروگ نہیں۔ لیکن کیا کرتی یہ جو آپ کے دوست ہیں نابھے راج بہادر
بنتے ہیں جی ہاں گوڑ صاحب ان کی راج ہٹ کے آگے پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ ایک مرتبہ
فون پر ہلاکی ڈنٹ پلائی تھی اور مضمون کا آرڈر دیکر دئی سروانہ ہوئے تھے۔ آپ کا دل
سے حکمتانہ وصول ہوا۔ انھیں سمیانہ میں مقالہ پڑھنا ہے (سبحان اللہ) یعنی ہم اور سمیانہ
میں مقالہ پڑھیں گے! ابھی ہم اس پیار بھر حکمتانہ سے پہلو بچانے کے بہانے ہی تلاش کر رہے تھے کہ
لاہوری صاحب نے فون پر دھونس مانی کہ ”تمہیں پڑھنا ہے“ ہم نے شکل تمام مرونی کام ظاہر کر کے ہو ہوا کہ اپنی
زندگی میں کبھی مقالہ نہیں لکھا۔

ہم تو اس کے معنی و مفہوم سے بھی بے بہرہ ہیں کسی پڑھے لکھے کو تلاش کیجئے۔
 سمجھنے لگے ہماری فہرست تیار ہو چکی ہے تمہارا نام شامل کر دیا گیا ہے تمہیں تو لکھنا ہی ہے گویا تقدیر کا
 لکھا مٹایا نہیں جاسکتا۔ مگر محترم صاحب میں دونوں کو بھل دے گئی اور یادوں کا سہارا لے کر
 آپ سے مخاطب ہوں۔

بھلا آپ ہی انصاف کیجئے اگر آپ پر کچھ سکتی تو کیا آج تک خاموشی رہتی۔ اس میں شک
 نہیں کہ دل میں خواہشیں ضرور ملتی رہیں کہ کچھ لکھ کر آپ کو نذر عقیدت پیش کر دوں لیکن آپ جیسی
 پہلو دار شخصیت پر قلم اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن ذرا ٹھہریئے آپ کی شفقت، خلوص
 اور وضع داری کے نقوش آسانی سے مٹنے والے نہیں یہی نقوش اب خوشگوار یادوں میں بدل
 چکے ہیں اور جب سے آپ گئے ہیں یہ یادیں کچھ زیادہ ہی قیمتی بلکہ انمول ہو گئی ہیں۔ بقول وہ صاحب
 ”جانے والے کبھی نہیں آتے سوکھ جانے والوں کی یاد آتی ہے“

آپ کو بھلے ہی یاد نہ ہو مگر مجھے آپ کا پہلا تعارف کل کی بات معلوم ہوتا ہے سنگھ
 کے ابتدائی سالوں کی بات ہے غالباً کوئی کانفرنس ہو رہی تھی باہر سے بہت ادیب و شاعر آئے ہوتے
 تھے۔ صاحب احسن اور صفیہ آپا مرجمہ (صفیہ زہیر) ہمارے یہاں ہی بنجارہ ہلز پر مقیم تھے۔ دوپہر
 کے کھانے پر تمام مہمان مدعو تھے۔

میں نے ابھی اسکول پاس نہیں کیا تھا اور عمر کا یہ وہ حصہ تھا جب ادب سے زیادہ ادیب
 اور شعر سے زیادہ شاعر کی شخصیت متاثر کرتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کسی مشہور ہستی سے تعارف کیا
 ہوتا معراج مل جاتی۔ اور اس دن تو اتنے ڈھیر سارے مشاہیر کو دیکھ کر میں تو جیسے بوکھلاسی گئی۔
 ایسا تعارف کر رہے تھے، یہ خواجہ احمد عباس ہیں، یہ کرشن چندر ہیں یہ سردار جعفری ہیں، ارے بھی
 مخدوم یہ میری لڑکی فالمر ہے۔ اور نہ جانے کتنے نام، ہمیں سے تو کالوں میں رہیں سائیں ہو رہی تھی۔
 پھر ان سب سے کئی دن ملنا جلنا ہوتا رہا اور میں بوکھلاہٹ پر تابو پاتی گئی۔ ایسے یادگار موقع پر
 آنسو گراؤ کا نہ ہونا نہایت بد ذوقی کی علامت سمجھی جاتی ہے ہم بھلا کیوں چوکتے سب ہی ہماری

کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھا اور آپ نے تو کمال ہی کر دیا آپ نے لکھا تھا۔

فاطمہ تو ابروتے اُمت مرحوم ہے

ذوقِ تیری مشیتِ خاکِ مغھم ہے ^{مقصود}

کیا بتاؤں مخدوم صاحب میں اس شعر پر کون قدر اتراتی تھی اور اپنی سہیلیوں میں کیسی کیسی شغیلاں بگھاری تھیں اور اندر ہی اندر دل نے پکارا تھا کاش فاطمہ بہت عبد اللہ کے بجائے بہت غفار ہوتیں۔ دیکھتے تو یہی بچن اور جوانی کے دور ہے پر کیسی مضحکہ خیز سوچیں سراٹھاتیں ہیں مسکرا پڑے آپ بھلا ملائیے ہاتھ۔

یاد ہے آپ کو ایک مرتبہ آپ ہمارے یہاں آکر چھپے تھے شاید اسی کو (UNDEF-ROUND) کا نام دیا جاتا ہے۔ سارا دن تو آپ یا پٹر صفے یا تصویروں کے اہم دیکھا کرتے اور شاہین شعر و نغمہ میں ڈوبی ہوئی آیتیں اُبادل کھول کر داد دیتے جاتے اور شعر سناتے کا وصلہ تیز ہوتا جاتا۔ اب جو میں یہ سطرین لکھ رہی ہوں ساری یادیں ذہن کے جھروں سے نکل کر نظروں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔

پھر یہ بدن، لمبا قد، کھڑا، ناک، نکتہ، دبتا ہوا رنگ، بلگے کپڑے، پریشان بال لا ابالی سا انداز، ہاتھ میں سگریٹ اور عمر تو پتہ نہیں ممکن ہے ۳۰ سال ہو یا پھر ۴۰ سال بھی ہو سکتی ہے اس معاملہ میں آپ نے سب ہی کو دھوکے میں رکھا۔ یہ دیکھتے ترنم کی، لہروں پر ”انتظار“ کی نیا ڈول رہی ہے۔

رات بھر دیرِ فناک میں لہراتے رہے

سانس کی طرح سے آپ آتے رہ جاتے رہے

ہم یوں دم سادے بیٹھے تھے کہ کہیں اس سلسلہ آمد و رفت میں ہماری سانسیں،

رکاوٹ نہ بن جائیں۔ بیتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے

سجدہ مسرور کہ مسجد کو ہم پاہی گئے

سے اختیار سب کی نظرس غلام میں تیر گئی جیسے آہٹ پکان اور دل میں اضطراب کی کیفیت ہو۔
انتظار کی کشتی بچکولے کھاتے لگی آس ٹوٹنے لگی۔

صبح نے سچ سے اٹھتے ہوتے لی انگڑائی
اوصا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

کپ شکست ماننے والے کب تھے بالوں ہناتا تو آپ نے جانا ہی نہ تھا آپ نے پیتر ابد لا خوش آمد
اور انجا پر اتر آتے۔ اپنی نیندوں کا واسطہ دے کر آواز پر آواز دیتے رہے۔

میرے عجیب میری غیر اڑانے والے۔ میرے مسجود میری رعب پر چھانے والے
آج بھی جانا میرے مسجودوں کا ارمان نکلے۔ آج بھی جانا میرے قدیوں پر میری جاں نکلے
ماحول پرستنا چھا گیا سب محسوس انتظار بن گئے جیسے مسجود اب آیا اور اب آیا!

ایک دن آپ نے ”طور“ سنا۔ آپ ترنم ریز تھے۔

دلوں میں اثر دہاں آرزو لب بندر جتے تھے نظر سے گفتگو ہوتی تھی م الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیا کرتے تھے
کتنا پاکیزہ تصور کیا معصوم اظہار اور پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر پیا کر کیا جاتے تو وہ کیوں نہ مسکرا
آخر پیار بھی تو خدا کی ایک صفت ٹھہری!

لیکن مخدوم صاحب شکایت رہ گئی کہ باوجود امرار کے آپ چند دن سے زیادہ نہ
ٹھہرے آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کب آپ کی موجودگی قاضی صاحب کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے
اور چپکے سے کھسک لے۔

آزادی سے ایک آدھ سال پہلے پھر ایک کانفرنس کی دعوت مچی اس مرتبہ کفنی صاحب
اور جعفری صاحب بنارے مچان تھے۔ برسات کا موسم اور وہ بھی پنجاب کی برسات کا سماں
مت پوچھئے۔ باہر لکی لکی پھوار پڑ رہی تھی۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ جیسے کفنی صاحب
چونک سے پڑے جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ بڑے سہمے سہمے انداز میں بولے بھی سا حلاوت ہو گیا!

قاضی محمد عبدالغفار

سب کی سوالیہ نظریں کیفی صاحب کی طرف اٹھیں اور آپ ہنس پڑے۔ آپ نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا
 ”ساحر کا کوئی قصور نہیں بلکہ کایا ہی تقاضہ ہے“ اور ہاتھ بٹھا دیا ملاوٹا تھا یہ آپ کی عادت تھی۔
 اصل میں تو ساحر برسات کا لطف اٹھانے کے لئے بوند باندی ہی میں بغیر کبے سنے چہل قدمی
 کو نکل پڑے تھے !

ساحر صاحب دایس آچکے تھے چائے کا دو چل رہا تھا۔ پیالوں کی کھٹک ہلکی ہلکی پھوار
 ہواؤں لطیف جھونکے گویا شاعر سے دل کو تڑپانے کا پورا سامانہ ! لیجئے محفل شعریہ کی خوب
 سنا اور سنائیگیا ابائی فرمائش پر آپ گنگنا اٹھے۔ آپ پوچھ رہے تھے

گمرباں چمک محفل سے نکل جاتوں تو کیا ہوگا، تری آنکھوں سے سونہن کے ڈھل جاتوں تو کیا ہوگا
 جنوں کی لغزشیں خود پروہ درازِ الفت میں و جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا
 غمرباں کی بات پھر جنوں کی لغزشیں اور سنبھل جانے پر اصرار بھلا برسات کی رات بھی کسی کو سنبھلنے دیتی ہے
 آپ سب کو جواب طلب نظروں سے لکھ رہے تھے اور کمرہ واہ واہ کی صداؤں سے گورخ رہا تھا۔

ابائے حیدر آباد سے چلے جانے کے بعد ایک عرصہ تک یہاں کے لیل و نہار سے بے فہمی رہی
 آزادی کے بعد آبا کا یہاں آنا جانا شروع ہوا بھلا وہ حیدر آباد آئیں اور گھر پریشا عہ نہ ہو۔ آپ کو جیل
 سے جھوٹے ٹکڑے ہوتے تھے ابائے ایک چھوٹے سے مشاعرہ کا اہتمام کر ڈالا طے یہ ہوا کہ سب کھانا بھی ساتھ
 کھا لیں گویا کھانا کھا کر محفل شعریہ کی سورت ادا کریں۔ اس دن خالص بیوی مار کر کھانا تیار ہوا تھا۔

آپ نے چپکے سے پوچھا تھا ”اچار نہیں کھاتی ہو“ میں نے تو سر ہی پیٹ لیا خدا کے لئے مخدوم صاحب
 قہر سے ساتھ اچار کی بات نہ کیجئے۔ پھر میں نے پوچھا کھانے کے بعد چائے یا کافی۔ آپ نے کافی
 پسند کی مگر کافی کی پیالی دیکھ کر آپ کو سخت کوفت ہوئی کہنے لگے ”اگر معلوم ہوتا کہ پیالی اتنی چھوٹی
 ہوگی تو چلے ہی مانگتا“ کافی کے دوران ہی شعر و شاعری کا دور شروع ہو گیا۔ یوں تو آپ نے کئی
 چیزیں سنائیں لیکن ”قید“ کا لہجہ تو کچھ اور ہی تھا۔ آخری شعر پڑھتے آتے آپ کیسے
 اداس ہو گئے تھے کچھ پچھتاہ پچھتاہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

مجھے غم ہے مرا گنج گراں مایہ عمر

نذرِ زنداں ہوا

نذرِ آزادی زنداں وطن کیوں نہ ہوا

اس محفل میں شاہد صدیقی، ڈنڈا، اریب اور ساجد بھی شریک تھے آپ کی تو اب ان سب سے خوب ملاقاتیں رہتی ہوئی اور کیا عجب کے قاضی صاحب وہاں بھی مسکرا مسکرا کر شعر سناتے اور جھوم جھوم کر داد دیتے ہوں گے ہمارے لئے تو یہ محفل یادگار محفل بن چکی ہے۔ آپ سے زیادہ تر ملاقات اردو ہاں میں ہوتی اور وہیں دو چار باتوں کا موقع مل جاتا میں ذرا قابل لوگوں سے دور ہی رہتی ہوں لیکن آپ کو میں نے کبھی قابلیت بگھارتے نہیں دیکھا۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس نے کس قسم کی بات کرنی چاہیے۔ بات کرنے کا اگر کوئی آپ سے سیکھے۔ بات چیت کا اس قدر ہلکا پھلکا ڈھنگ اختیار کرتے کہ آپ کا مخاطب خواہ مخواہ اپنے کو قابل سمجھنے لگتا۔

آپ کو معلوم تھا کہ میں خواتین کی جاوید بجا طوفانی کرنے میں بدنام ہوں آپ میری دکھتی رگ کو چھیڑنے میں کبھی نہ چرکتے۔ ایک مرتبہ خواتین کی بات چل رہی تھی۔ مجھے چھیڑنے کے لئے آپ نے بڑی مصمم صورت بنا کر کہا ”سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت اذال کیوں نہیں دے سکتی تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم انرا آئے طوفانی پر اور کہا۔ ”اذال تو چھوڑتے پیغمبری بھی عورت کو کب ملی ہے۔“ جناب مخدوم صاحب خدا کے بعد تو عورت کا نمبر آتا ہے کیونکہ وہ بھی تو خالقی ہے اگر اللہ میاں عورت کو تخلیق کا کام نہ سونپتے تو وہ موزن بھی ہوتی اور پیغمبر بھی! میسر پھرنے پر آپ کس قدر لطف اندوز ہو رہے تھے!

غالب مدنی کے سلسلے کی کوئی تقریب تھی ایک منسٹر صاحب مسلسل بول رہے تھے جیسے برسوں سے بات کرنے کو ترستے رہے ہوں۔ چند خواتین برآمدے میں چپ چاپ سی بیٹھی تھیں مقابل کی بنچوں پر۔ کچھ حضرات باتوں میں مصروف تھے آپ بھی اتفاق سے ادھر ہی نکل آتے ہم لوگوں کے درمیان بیٹھتے، ہوتے بولے۔ ”حیرت ہے کہ آپ لوگ باتیں نہیں کر رہے ہیں!“ میں نے کہا دیکھ لیجے باتیں کرنے

میں ہم ناحق بدنام ہیں آج ثابت ہو گیا کہ باتونی کون ہیں۔

اپنا خلوص تو آپ بس بانٹے پھرتے تھے ہر ایک کو یہ دعویٰ کہ مخدوم صاحب ہمارے ہیں۔
حمید آباد سے باہر ہونے کی وجہ سے جشن مخدوم میں شریک نہ ہو سکی۔ اریب صاحب نے لکھا
”تمہاری غیر موجودگی کو مخدوم نے بہت محسوس کیا“ یقین نہ آیا سوچا اریب نے خوش کہنے والی بات لکھی
ہے لیکن جلدی ہی تصدیق ہو گئی جشن کے بعد پہلی ملاقات میں پہلی بات آپ نے یہی پوچھی ”کہاں غائب
ہو گئے تھیں“ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے موقع پر جب کہ دور دور سے بڑے بڑے لوگ
جشن میں شرکت کیلئے آتے ہوئے تھے میری غیر حاضری کو آپ نے محسوس کیا اور شکایت بھی کی،
آپ کے اس احساس کو کیا نام دوں؟

رضیہ آپا سجاد ظہیر خیرے پاس ٹھہری ہوئی تھیں عصمت آپا بھی آگئیں اور آپ بھی بڑا پُر
لطف وقت گزارا۔ میری طرف دیکھ کر عصمت آپا بالیں یہ تو کچھ اپنی سی لگے ہے، آپ نے فوراً کہا۔ اپنی
تو ہے ہی قاضی صاحب کی بیٹی اپنی ہی تو ہوئی کتنی وضعداری تھی آپ میں اور اس وضعداری کو ساری
زندگی نباہتے رہے آپ!

اردو ہال سے واپسی پر اکثر دیر ہو جاتی ہال سے باہر نکل کر آپ پوچھتے کیے جا رہے ہیں۔
کہتی پیدل آپ کہتے اچھا چلو ہمیں پہنچاتا ہوا چلا جاؤنگا۔ مجھے گھر تک بحفاظت پہنچانا گویا آپ کے فرائض
میں داخل تھا۔ راستے بھر ادھر ادھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ ایک بار میں نے کہا نیا مکان بنایا ہے۔ کوئی
اچھا سا نام سوچ کر بتائیے۔ کہتے لگے ”بھئی ہمارے ایک دوست نے قرض لے کر مکان بنایا تھا تو
اس کا نام ”مقرضہ“ رکھا تھا۔ پھر آپ نے ہنستے ہوئے ہاتھ بٹھا دیا۔ ملا تو ہاتھ! انام تجویز کرنے کا
وعدہ بھی کیا مگر پورا نہیں کیا یہ شکایت رہے گی آپ سے!

دلی جانے سے چند دن قبل اُنچو ہال میں آپ سے ملاقات ہوئی میں کچھ فاصلے پر کھڑی
تھی پکار کر آپ نے کہا۔

”کل کاغذات میں تمہارا ایک خط ملا۔ تم نے لکھا ہے کہ اگر میری میگزین کے لئے کچھ نہ

لکھا تو اس کا دل ٹوٹ جاتے گا، کس قدر بچکانہ مضمون تھا! میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔
 بھی خط کا مضمون سر بازار تو نہ سنائیے لوگ کیا کہیں گے!! اور یہ آپ سے آخری ملاقات
 تھی۔ کاش خبر مہوتی تو جی کھول کر باتیں کر لیتی، چند یادوں کی یہ جیت جھلکیاں ہی میری طرف سے
 نذرانہ عقیدت سمجھ کر قبول کر لیتے، جشن کے ہنگامے میں بھی ایک چپ پہنا ہوا ہے جب سے

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے

شاخ گل کھوئی ہوئی مرغ خوش الحال چپ ہے

افق دل پہ دکھاتی نہیں دیتی ہے دھنک

غیر وہ موسم گل ابر بہاراں چپ ہے

اور اس چپ کی وجہ جانتے ہیں آپ؟

سو گیا ساز پر سر رکھ کے سحر سے پہلے! ایسا کیوں کیا مخدوم صاحب!



نہ میں اور نہ تُو اور نہ وہ جاودانی
 ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

مخدوم

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
 مسکراتے ہوئے ٹکڑے ہیں طوفانوں سے

مخدوم

آغا حیدر حسن مرزا چند یادیں

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایسی ہستی پر قلم اٹھانا بہت آسان ہے جسکو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہو۔ بے شک یہ ظاہر یہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن معاملہ اسکے برعکس ہے۔ مشکل اس وقت آپرٹی ہے جب آپ جانی پہچانی اور عزیز شخصیت پر واقعی لکھنے بیٹھ جائیں۔ اس وقت ہوتا ہے کہ اسی ہستی سے وابستہ یادیں بلفار کرتی ہیں۔ اور ذہنی کچے پر دسے پرسیما کی تصویروں کی طرح گزرنے لگتی ہیں یہی نہیں بلکہ ہر یاد یہ اصرار کرتی ہے کہ پہلے ہمیں لکھو! پہلے ہمیں لکھو! اور اس وقت یادوں کے بھومرچ چند یادوں کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

آغا چچی کے ساتھ بیٹے ہوئے دنوں کے کچھ بچوں بھی زیادہ گہرے ہیں کہ انھوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی سرچرٹھا رکھا تھا میری کسی بات کو رد کرتے تھے میرے کہنے پر کسی بات کے لئے جی نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جایا کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ نظام کالج کے ان کی صدارت میں ادبی مغل رگھنا چاہتے تھے لیکن آغا چچا نے معذرت کر لی لڑکے میرے پاس آئے کہ ان کے ساتھ چل کر سفار شس کروں پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا لیکن ان کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو میں ان کے ساتھ آغا چچا کے یہاں پہونچی۔ مجھے دیکھتے ہی طالب علموں سے بولے اچھا اسے لیکر آئے ہو! خوب میری کمزوری سے کام لگالا! اب انکار تو نہیں کر سکتا ضرور آؤں گا۔ مگر میں ناچھے لینے آ جانا یہ تھا ان کا محبت بھرا رویہ میرے ساتھ ملا کر انکی یاد آتی ہے تو آج میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بہت سچے چھوٹے ہوئے بچپن کے وہ دن ایک ایک کر کے سامنے آنے لگتے ہیں اور جی بے چینی ہوا اٹھتا ہے۔

در بیان سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے شانے سنہری لمبے بال بڑی بڑی بڑی مائل ترہریسی آنکھیں جن میں شونہی بھی ذہانت بھی محبت اور مروت کے ساتھ ساتھ انسان کو پرکھنے کا سلیقہ بھی چہرہ دار ہی موچے سے آزاد۔ شہابی رنگت لباس میں دلہنی مکر تارہ شمع ہی کا چوڑا پیر میں سلیم شہابی غرض مرتاپا اعلیٰ ہی نفل یہ ہیں وہ آغا حیدر حسن مرزا جن سے میں پہلی بار نہ جانے کب ملی تھی۔ لفظ ”پہلی بار“۔

رسمائے کہہ لیجئے ورنہ آغا صاحب تو پہلی بار ہی یوں ملتے جیسے ہر سوں کی ملاقات ہو چکے اس طرح اور ایسے ڈھنگ سے ملتے کہ انکے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلی ملاقات کا تصور ہی مٹ جاتا۔ سلام دعا کی نوبت بھی نہ آنے پاتی ایسی چھٹی چھوڑ دیتے کہ ہنسی کے فواروں میں تکلف کی دیوار ڈھب جاتی، ہنسی رکتی تو آنے والے کے خاندان کا حال احوال اس طرح پوچھتے جیسے اسکی سوچشوں سے واقف ہوں۔ (اکثر واقعیت نکل بھی آتی تھی) بھلا بتائیے پہلی ملاقات کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا۔

ہم نے بچپن میں اپنے خاندان کے علاوہ ایک اور کتبہ بھی دیکھا وہ تھا علی گڑھ انالیوں سمیٹھے کہ اگر کسی نے چھ مہینے بھی علی گڑھ میں پڑھا لیا تو علی گڑھ خاندان کا فرد بن گیا اسکے بعد اتنا کسے کسی حصے میں چلے جائیے ایک علی گڑھ دوسرے علی گڑھ کو ڈھونڈ نکالے گا۔ چنانچہ آغا حیدر حسن علی گڑھ حیدر آباد میں موجود تھے اب قاضی عبدالغفار کو حیدر آباد آنے میں کیا قیامت تھی! چلے آئے اور آغا حیدر کے دولت خانے یعنی صدر منزل میں معہ بیوی اور ایک عدد بیٹی کے ڈیر اڈال دیا ایک آدھ دن انہیں بیٹوں رہ پڑے نہ جانے اس زمانے کے دوست کس مٹی کے بنے ہوتے تھے ایک دوسرے سے بیزاری نہ ہوتے تھے شام ہوتی تو دو چار اور علی گڑھ جمع ہو جاتے ابھی خاصی محفل سج جاتی کاش اس وقت ہم میں اتنا شعور ہوتا کہ نہ صرف یہ کہ ان محفلوں کا لطف اٹھا سکتے بلکہ ان کی اہمیت کو بھی سمجھ سکتے ذرا سمجھیں تو آج اس انتشاری دور میں وہ محفلیں بزرگوں کا ورثہ بن کر ہمارے پاس محفوظ ہو جاتیں۔ افسوس کس طرح دے پاؤں وقت نکل گیا۔۔۔۔۔

آغا حیدر حسن کے دوستوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا اور دوست بھی ایسے جو خود بھی کسی نہ کسی حیثیت سے مشہور و معروف شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سید حسین خورشید احمد خاں، ڈاکٹر سلیم، خلیق الزماں غلام محمد، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غلام پیچکن اور علامہ حسرت بدایونی ان میں سے بعض ہستیاں تو مجھے یوں یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔

آغا حیدر حسن آثار قدیمہ نہیں بلکہ دلی کی گمشدہ تہذیب کی جیتی جاگتی مورت تھے۔ وہ ایک ایسی کڑی تھر جو ایک نسل کے ورثے کو دوسری نسل سے جوڑتی ہے۔

قلعہ معلیٰ اجڑ گیا تھا مغلوں کی دلی پر انگریزوں کو تسلط جمائے تیس سال ہو چکے تھے۔ تاہم درودیوار سے رنگ اڑا نہیں تھا محبت و مروت کی بوچھاڑ باقی تھی۔ تباہی کی داستانیں ذہنوں میں زندہ تھیں کہ مصطفیٰ خاں کی حویلی میں ۱۲ اگست ۱۸۹۳ء میں آغا حیدر حسن نے جنم لیا۔ ساراپنچین مانڈان کے اکیس پچاسی پانے والی کی یاد میں دکھ بھری کہانیاں سننے اور بھولی بھری یادوں کو دوہراتے بزرگوں کی آغوش میں گزرا۔ شاید ہی وجہ ہے کہ آغا چنانچے نے ان دنوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے زبانِ رہن سہن، لباسِ عادات و اطوار اور آداب کو اپنی ذات پر فرض کر لیا اور مرتے دم تک اس فرض کو نبھاتے رہے۔

دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی پھر دلی کے اسکول میں داخل کر دیئے گئے، علیٰ تعلیم کے لئے سرسید کے علی گڑھ ہوئے گئے۔ وہاں کے زندہ دلوں نے انکی بول چال کی مھاجت رہن سہن کی مھنساہٹ اور لباس کی رنگہی و نفاست کی وجہ سے انکو آپا جان کا خطاب دیدیا پھر قویہ ہونے لگا کہ جس کو دلی کی بیگماتی زبان سے لطف اندوز ہونا ہوتا ان کے کمرے کا رخ کرتا۔ آغا صاحب کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ کتاب تو شادی ہاتھ میں ایسے ہوں انکی تو زبان ہی کتاب تھی فصاحت و بلاغت گو کتاب میں مل سکتی ہے لیکن آغا صاحب کے لہجے کی شگفتگی اور لہجہ تو بس انھیں کا حصہ تھی چنانچہ آغا صاحب نے بیگماتی زبان ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا جب لکھنا شروع کیا تو اپنے ساتھیوں کے دیئے ہوئے خطاب کو نام کا جز بنالیا اور

”آپا حیدر“ کے نام سے اپنے کو متعارف کرایا اور اپنے منفرد طلب و لہجے کی وجہ سے لکھنے والوں میں منفرد مقام پایا۔

جب سیاست کی پرچھائیاں علی گڑھ پر پڑھنے لگی تو علی برادرانِ حکیم جمل خاں اور گاندھی جی کی مخالف سرکار سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا نتیجہ ظاہر تھا! دلی اور علی گڑھ دونوں کو خیر باد کہنا پڑا اور دکن کا رخ کیا۔ یہاں آکر تو ایسے بسے کہ حیدر آباد وطن ثانی بن گیا۔ قدم چمانے کے لئے طبیعت کے خلاف کچھ دن پولیس کی ملازمت کی پھر کالج میں اردو پڑھانے لگے۔ اُس دور کا حال تو ان کے شاگرد ہی مزے لے کر سنا سکتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حیدر آباد کی فضا انکو خوب راس آلی اور کیوں نہ آتی آغا حیدر حسن کا قلعہ معلیٰ سے قریبی رشتہ تھا درباری آداب و تہذیب انکی گھٹی میں پڑے تھے حیدر آباد آئے تو یہاں بھی رؤساءِ امراء کی صحبتیں میسر آئیں۔ یہ فرق مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ شاہی خاندان پر بُرا وقت پڑنے کے بعد بھی ان کا رویہ اس خاندان کے ساتھ نہ بدلا درباری آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ یوں تو اپنی ذات سے وہ بالکل قلندر تھے۔ دربارداری بھی جلبِ منفعت کے لئے نہیں بلکہ دل کو خوش رکھنے کا محض یہانا تھا۔ نہ کسی کے عہدے سے مرعوب ہوتے نہ ہی کسی غریب کو دیکھ کر منہ پھیرتے امیر غریب میں امتیاز کرنا انکی سرشت ہی میں نہ تھا بجانے کتنے غریب لڑکوں کو انھوں نے تعلیم بھی دلوائی اور روزگار سے بھی دلگایا خیرات اس طرح دو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو“ کی زندہ مثال تھے۔ غریب طالب علموں میں مقبول بن گئے دھوبی اور مہتروں کے لڑکے تک شامل تھے۔ ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں وہ یکساں عزیز تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ جس سے ایک دفعہ جس طرح مل لئے اخیر دم تک اس انداز میں فرق نہ آیا۔

آغا چچا بے حد شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچہ جوانوں میں جوان بڑی آسانی سے بن جاتے لیکن بوڑھوں میں بوڑھے بن سیمنا ان کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ رگِ طرافت ہر وقت پھر لگتی رہتی۔ اردو کی کلاس ہو یا جلسے کی صدارت خفیس قہقروں سے گونجتی تھیں۔

بہت پرانی بات ہے اردو ہال میں آل انڈیا شاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اب سے تیس سال پہلے کے مشاعرے کا تصور کیجئے کیسے کیسے شعرا جمع نہ ہوئے ہونگے شعر اگو سمجھ کر داد دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ چوٹی کے غزل گو شاعر اس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے مشاعرہ شروع ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا ایک گوری چٹی بزرگ خاتون قتریف لائیں اور سیدھی اسٹیج پر پہنچ کر صدر صاحب کے پہلو میں جا بیٹھیں گوری بھوکا صما کو گھرے رنگ کے صدر کے قریب بیٹھے دیکھ کر ہلا آغا چا کا ہے کو خاموش رہتے ہیں ان کے قریب ہی بیٹھتی۔ میری طرف جھک کر مرگوشی کے انداز میں بولے "لو بیٹا دن رات ایک جگہ ہوسکے" کچھ استقر بے ساختہ انھوں نے یہ جملہ کہا کہ میرے لئے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا میری جانب پر مدد بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے قضا کے بے رحم ہاتھوں نے سب ہی کو چھین لیا نہ وہ دن رات اور نہ ہی آغا چا۔!!

میری شادی سے پہلے کا واقعہ ہے جس گھر میں ہم رہتے تھے۔ وہ جگہ مجھے پسند نہ تھی۔ ایک دن آغا چا آئے اور میری جو شامت آئی تو باتوں باتوں میں نے کہا "آغا چا ہمارے لئے کوئی گھر دیکھئے نا" میرے منہ سے بات پوری ہونا تھا کہ وہ لے اڑے ابا کی طرف دیکھ کر بولے "دیکھ لیا جو ان بیٹی کو گھر میں بٹھانے کا نتیجہ؟ باوانے فکر نہ کی تو چچا سے کہنا پڑا کہ اس کے لئے گھر دیکھو پھر مجھے بولے "بیٹا صدمے جاؤں ضرور تیرے لئے گھر دیکھوں گا کچھ تو تیرے باوا کو غیرت آگئی اور تو جتنی دیر بیٹھے مجھ یوں پھرتے رہے جیسے کوئی ساتھ کی کھلی سہلی ہوں۔ مذاق پر اتر آئے تو کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ ایک دن انکی بیٹی شہزادی کے یہاں دن گزارنے پہنچ گئی۔ گیٹ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مل گئے دیکھتے ہی بولے "بیٹا، ہنسی کی چاہت میں تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ آج تیس سال کا ہے" اور چچا تیرا چا کر آدمی ان تاریخوں میں کس بھلے آدمی کی چیب میں ملے ہوتے ہیں ذرا تو چچا کی لاج رکھی ہوئی۔ چلی تو آئیں کہ میں شہزادی کے ساتھ دن گزاروں گی اب کھٹو جوار کی روٹی اور روٹیو چا کی جان کو تو جناب یوں ہمارا استقبال ہو ادھر ستر خوان پر تو اللہ کا دیاسب کچھ تھا مگر آغا چا کی زبان کے چٹکارے کی بات ہی کچھ اور تھی۔

میں اکثر اپنے مضامین انکو سنایا کرتی تھی ایک بار میرا ایک مضمون سنکر بولے "تیرے
 بارے میں دیکھنے چھوڑی یہ اچھا کیا کہ اپنی تحریریں چھوڑ گیا کہ نے بی بی اپنے نام سے پڑھ پڑھ
 کر سنا مائی جا اور پھولتی رہ" حوصلہ بڑھانے کا یہ انکا ایک انداز تھا۔

آغا صاحب جیسے خندہ رو اور شگفتہ مزاج بوڑھے کم ہی دیکھے میں آئے۔ بیٹی داماد
 ہندوستان سے باہر تھے۔ آغاچا ان سے ملنے گئے تو ادھر ہی کے ہو رہے۔ دکن کی ایک کہوت ہے
 "جیل آئی تو جینس اڑی" لیکن اکثر جیل نہ ہی اڑے تو بہر حال جینس اڑ جاتی تھی کچھ ایسا ہی معاملہ آغا
 جیدر حسن صاحب کے ساتھ پیش آیا یہ افواہ بڑے یقین کے ساتھ اڑ گئی کہ آغا صاحب نے
 ایک جرمن شہزادی سے نکاح کر لیا۔ اب تصدیق کیسے ہو۔!

خدا خدا کر کے آغاچا واپس آئے اور میں ملنے گئی دیکھتے ہی بولے اب عجایاد آیا میں نے
 بھی شکارنا کہا آپ سے بھی تو اتنا نہیں ہوا کہ بھتیجی کو آنے کی اطلاع کر دیتے غرض شکوے شکایت
 کے ختم ہوئے تو میں نے پوچھا اٹھنا ہے آپ نے نکاح کر لیا، گز بیگم تو کہیں اکھاڑی نہیں دیں۔
 بے حد سنجیدہ صورت۔ اکبر بولے "بیٹا چھوڑ آیا انکی جگہ کوئی ایسی سن گھڑت باتیں اپنے متعلق
 سنا تو اس تہمت پر چھڑا اٹھتا مگر آغا صاحب کے لئے مضحکہ خیز بات بن کر رہ گئی بلکہ ایک لطیفہ
 انکے ہاتھ آگیا۔

گودیں کھلی لڑکیاں بڑھیا گئیں تو بہت یافتہ جوان بزرگوں کی صف میں شامل ہو گئے
 خود آغا صاحب کچھ بھرے پرسفید اڑھی بھرانے لگی لیکن نہ انکے لہجے کی شرارت میں فرق آیا نہ
 طبیعت کی شوخی میں باتوں میں چہل مرتے دم تک رہی۔ دل کے مرض نے ادھوا کر دیا تھا
 عزیزوں اور ملازموں سے تیمارداری کے روادار نہ تھے احتیاط اور پرہیز کے نام سے چہرہ ہی تھا
 اکثر بڑا کڑے سے شکایت کی گئی کہ صاحب کسی کی نہیں سنتے۔ ڈاکٹر نے ڈراتے ہوئے کہا ایکو
 کس کی ضرورت ہے دل کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے ایکو معلوم ہونا چاہیے کہ دل کا بہت
 پھوٹا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ جو کام کر رہا ہے اس پر زیادہ بار نہیں پڑھنا چاہئے ڈاکٹر کی ہدایت
 پر عمل کیوئے۔ جب ڈاکٹر بات ختم کر چکا تو جینس کر بولے "عجیب بات بتائی آپ نے

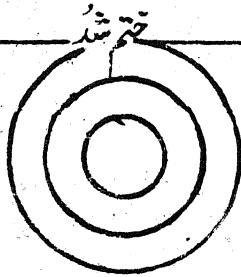
ساتھ برس سے اوپر ہونے کو آئے کہ میں دونوں ہاتھوں سے دل لٹا رہا ہوں اور تم کہتے ہو اب بھی کچھ حصہ باقی رہ گیا۔ ”اگر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا آقا صاحب آپ سے کوئی ہنس جیت سکتا۔“

لیکن یہ بنے ہنسانے والا شوخ مزاج بوڑھا جوہر نفل میں قہقہے بانٹا کرتا تھا اپنی ٹٹی ہوئی دلی کے غموں کو ہلویوں سیٹھے ۵ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ انکے ایک مضامین کا مجموعہ ”پس پردہ یادگار ہے اور کئی مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں کچھ انکے نادر کتب خانے کی کتابوں کے حاشیوں پر یادداشتوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ بچوں کی کہانیاں اور مختلف عنوانات پر خود آغا چاچی کی زبانی کئی مضامین آمل انڈیا ریڈیو کے پاس موجود تھے کاش یہ تمام تحریریں چھپ جائیں ورنہ اب پرانی دلی کا کوئی آغا حدر حسن حیدرستان گو تو میری نظر سے نہیں گزرا۔

آغا چاچی کے داماد میر معظم حسین صاحب نے آغا چاچی کے رہائشی مکان کو میوزیم کی شکل دیدی ہے مختلف کمروں میں انکے جمع کئے ہوئے ذخیرے کو بڑے سلیقے سے الماریوں میں سجایا ہے کتب خانے کو نئی ترتیب کے ساتھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کو استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ کتب خانے سے متصل وسیع ہال بتیل ہے جہاں آرام سے بیٹھ کر کام کیا جاسکتا ہے۔ کتب خانے کے علاوہ پرانے لباس مخطوطات زلیب خطوط اور آغا چاچی کچھ تحریروں کے مسودے بھی رکھے گئے ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جو دلی کی پرانی تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔

معظم بھائی کی یہ لگن بلا وجہ نہیں ”آقا“ کے لاڈلے شاگرد اور اکلوتے داماد ہیں۔ ان دونوں کا یہ رشتہ قابل رشک بھی تھا اور قابل فخر بھی۔ معظم بھائی بڑی خوبیوں کے انسان ہیں بے حد جذب سائنس اور بااخلاق۔ ساری زندگی علم کی خواست کی اور آج بھی وہ غلے نہیں بیٹھے سماج کے کمزور طبقے کو اونچی اٹھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی گفتگو نشست برخواست ان قدروں کی نشاندہی کرتی ہے جو انکو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملیں ہیں۔

دیکھئے مضمون ختم ہو رہا ہے اور مجھے آغا چچا کی وہ بات یاد آرہی ہے جو ابلا پلر
 لکھنے پر میرے ایک مضمون کو سنکر کہی تھی انھوں نے کہا تھا ”بیٹا جی چاہتا ہے کل کامرتا
 آواز دے رہا ہوں اور تو بچہ پر ایسا ہی مضمون لکھتے ہیں نے تجھ کو کہا بھی ایسی بات زبان
 سے نہ لکھانے اور یہ بھی تو سوچے کہ آپکے بعد مضمون لکھا بھی گیا تو سزاؤں کی کس سے!
 اور آج مضمون لکھ دیا ہے۔ تو سوچ رہی ہوں یہ کیسی مجبور رہی ہے! کاش شش ہنگام
 سنا سکتی۔



اب کا بچہ کادہ دماغ میں جبرٹھا کہ کھانے سے ادراج پھر شئی۔ بغیر ٹھٹھے دیکھے
 ہی سے پینٹ بھر گئی۔ اچھی اتم کہو گی تو ہی کہ شکل نگوی چرمیوں کی سی اور دماغ بیروں
 سے بڑھ کر۔ اسے ہے میں جو اس عجیب کو محسوس کر کے یقین جاتی ہوں مگر میں کیا
 کروں کوئی میرے پس کی بات ہے۔ دلی بیماری میں میری اٹھان ہی کچھ اس ڈھب
 سے ہوئی ہے۔ کہ کبھی باہر کسی جگہ ہی نہ رہی۔

”پولیس اپر دہ“
 آغا حیدر حسن دہلوی



ادبی محفل

کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو اپنا سنا بھی پیا را نہیں! کبھی کبھی تو عمر بھر کی
تغلیاں بھی حال کی دلکشی سے زیادہ خوبصورت لگتی ہیں۔ سائنس کے ایک رنگین تجربے کی ہزاروں
رنگینیوں کو قربان کر دینے کو بی چاہتا ہے۔

بعد اسوچے تو مجھے یادوں کے اس جھوم سے کسی ایک واقعے کو نکال کر یہاں کرنا کہتا
مٹھل کا ہے۔ ایک آدھ ادبی محفل ہو تو لکھنؤ میں تو یادوں کے خزانے میں بیگانوں کی محفلیں کچھ اس
طرح گڑبڑ ہو گئی ہیں کہ کسی ایک محفل کو اس میں سے علیحدہ کرنا اس مسئلے سے کم نہیں

بہر حال ایک محفل کا ذکر کرتی ہوں لیکن پھر بھی یہ وعدہ نہیں کر سکتی کہ اس محفل پر جو
جو حضرات آپ سے ملیں گے وہ سب ایک ہی نشست سے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اس میں درچار
ایسے بھی ہوں جو خیالوں ہی خیالوں میں مختلف محفلوں سے اٹھائے گئے ہوں کیونکہ یہ
اس زمانے کی بات ہے کہ شاید ہی کوئی چیز ایسا کرتا ہو کہ ہمارے گھر پر ادبی بیٹھک نہ جتی
ہو۔ ایسی صورت میں صحیح طور پر یہ کہنا کہ کون شاعر کس محفل میں اور کس میں نہیں ملنا ممکن ہی بات ہے۔

اب سے برسہا برس پہلے کی بات ہے جب ہم لوگ بھارت پر رہتے تھے، اخبار پیغام
کی دھوم مٹی ترقی پسند تحریک کے لئے تبلیغی کام شروع ہو چکا تھا! شہر میں ہر طرف اردو کا فرسوس
پا رہا تھا۔ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے سے شعرا اور ادیب جمع ہو چکے تھے۔ کانفرنس کا ہنگامہ
مڑی کاسیابی کے ساتھ ختم ہو چکا تو شعرا کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر پر ایک
شاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاریخ اور ادبی مقرر ہونے کے بعد تیاریاں شروع ہوئیں۔

لکھانے پر کیا کیا لوازمات ہونے چاہئیں اس پر آپ سے خاصی بحث رہی۔ ان کا پس چلتا تو نہ جانے کیا کیا پیکو اڑاتے۔ وہ تو کہیے ہم سے انکی زیادہ چلنے نہ دی لیکن اس سے کوئی خاص فرق بھی پڑا کیونکہ جب تک کھانا نیز مرزا گیا ابا مختلف سوالات سے ہم کو بوکھلاتے رہے۔ کھانا لذیذ ہوا اور افرط سے ہو ہی ان کی دو شرطیں ہو کرتی تھیں۔

یہ مشاعرہ کسی نواب یاراجہ کے محل میں بین بلکہ ایک مزدور کے یہاں تھا۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے صحافی مزدور نہیں تو پھر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں وہ لوازمات تو نہ تھے جو مشاعرے کے شایان ہوتے مثلاً فرش تو تھا مسند اور شمع نہ تھی۔ شعرا تھے میر مشاعرہ نہ تھا کسی قسم کی سجاوٹ بھی نہ تھی رستہ آسمان پر تاروں نے جھللاتا شامیانہ نور تان۔ کھانا گویا ہماری محفل کی سجاوٹ میں فطرت دل کھوں کر حقہ لے رہی تھی۔

پہلو سے کے ایک کونے میں بیڑ جن دی گئی تھی ٹوفے کا انتظام تھا اس نے دیکر سوئی پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی تھی اور یہ طریقہ گویا نہایت غیر شاعرانہ مزاق کی گواہی دے رہا تھا۔ فرشتہ پر ادھر ادھر کا ڈنکیے اور کھن رگھ دے گئے تھے۔ ٹھٹھے کی جگہ سکریٹ سے پوری کی تھی تھی پان کی گالوریاں سیلتے سے خاص دان میں جمادی گئی تھیں اور شاید یہ گلو یاں تہنا مشاعرے کے لوازمات کی قائم مقامی کر رہی تھیں۔ غرض وقت مقررہ پر جہان آنا شروع ہو گئے۔ بیل عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جب کہ مشہور سٹیوں سے ملاقات کرنا باعث فخر اور پھر اپنے ساتھیوں میں فخر کے ساتھ اس کا چرچا کرنا مقصد حیات ہوتا ہے اس محفل میں بعض ہستیاں ایسی ہی تھیں جنہیں میں پہلی بار دیکھنے والی تھی۔ اسکا ان کے زمانے میں۔ جو شعرا ہی سے واسطہ رہا تھا۔ جیسے جگتے چتے پھرتے شعرا کا انہمور کچھ عجیب سماجیات معلوم ہو رہی تھی۔

پر مٹھنے اور مٹھنے دانوں کی نہرست کافی طویل تھی جو نام اب تک ذہن میں رہے گئے ہیں غرض کرتی چلوں اس مشاعرے میں آغا حیدر حسن، جگر مراد آبادی، فضل الرحمن،

سکندر علی وجہ ہوش بگرانی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تالپال، مخدوم فی الدین، ساحر دھیانوی اور ایک صاحب سری نواس لاہوٹی شریک تھے۔

ادیب اور شاعر ایک جگہ ہو جائیں تو اسی محفل کارنگ ہی جدا ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو تھمتھ میں جو لطف آتا ہے۔ اس کا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے ان کی معمولی سی گفتگو بھی ادب پارے کہلانے کے قابل ہوتی ہے۔ جو بات بھی زبان سے نکلتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ سستے آئے ہیں کہ شاعر کی زندگی ناکامیوں میں بسر ہوتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی نامرادیوں کا مذاق اڑانا بھی خوب جانتا ہے۔ جب ہی تو زبان سے

ادا ہونے والا ہر لفظ زندہ دلی کا اعلان معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے سب مہمان اچکے ہیں آئیے کھانے کی طرف چلیں۔ ارے انھیں بھی دیکھا آپ نے درمیانہ قد سا نولارنگ ڈیلے بتلے سر پر بالوں کا ڈھیر کرتے پاجامے میں ملبوس جو صاحب بے حد معروف نظر آ رہے ہیں کبھی آیا ہے قریب اگر سرگوشیاں ہوتی ہیں کبھی مہمانوں سے یوں مخاطب ہیں جیسے پرسوں کی ملاقات ہو۔ ہمارے گھر کی کوئی محفل ہو ان کا رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ کہیں کچھ یاد آیا؟ اتنے اتنے پتے کہ بعد میں نہ پہچانیں تو آئیے میں ہی تعارف کرادوں۔ تو یہ میں بوجہ صاحب سری نواس لاہوٹی بے حد غلصہ دوست باش اور وضع دار انسان ہیں۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا قسم کا مزاج پایا ہے۔

مسلمان صورت مگر ترکاری خور ہندو ہیں چونکہ روشن خیال اور ترقی پسند ہیں کبھی کبھی گوشت کا سالن بھی کھاتے ہیں اگر اتفاق سے ارو یا یاد کے دھوکے میں گوشت کی بوٹی منہ میں چلی جائے تو کچھ مذاق نہیں سمجھتے۔ ان کے مسلمان صورت ہونے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یوں اسکو لطیفہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

ہوایوں کہ پوئیس ایکٹن کے بعد لکھنؤ جاتے ہوئے گاڑی بدلنے کے اسٹیشن پر اترے تو چند اشرا نے مسلمان کچھ کر گھیر لیا۔ اب لاہوٹی صاحب کا اقرار کہ خدا کی قسم میں ہندو ہوں اور اشرا کی حیرت کہ خدا کی قسم میں کھاتا ہوں اور اپنے کو ہندو بھی کہتا ہے۔ ان کی مٹکونڈا جی کس طرح ہوئی یہ تو وہی بتا سکتے ہیں میرا مقصد تو صرف ان کا تعارف کرانا ہے۔

لیجے ہیں تعارف میں رہ گئی اور لاہولی صاحب ہمانوں کو کھانے کے طرف پہنچا بھی گئے۔ ذرا دیکھئے اس وقت ہمان اور میزبان میں تمیز کرنا مشکل ہے سب ایک دوسرے کی خاطر بھی کرتے جاتے ہیں اور باتیں بھی ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتی ہوں آغاچی تنہا کرسی پر بیٹھ گود میں پلیٹ رکھے کھانے میں مصروف ہیں۔ میں نے قریب جا کر پوچھا آپ سب سے الگ کیوں آئیے؟ کہنے لگے بیباقانی کی جنت میں یہ دن بھی دیکھنا تھے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ہاتھ پر روٹی دھرے گا تو اللہ قسم ہرگز نہ آتا۔ میں کچھ چھینپ سی گئی تو ہنس پڑے اور میری جان میں جان آئی۔ آغاچی کو دو چیزوں سے سخت نفرت ہے ایک کھڑے ہو کر کھانا دوسرے مالک پر بات کرنا۔ خیر صاحب کھانا تو جو کچھ تھا سو تھا دلچسپ گفتگو نے کھانے کی لذت کو دو بالا کر دیا بلکہ یوں کہے کہ کھانا کم اور باتیں زیادہ رہیں۔

کھانا ختم ہوا سب اپنی اپنی جگہ فریش پیراجان میں۔ پان اور سگریٹ کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اب شاعر سے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ خدا خیر کرے یہ تو نکھنوں کی پہلے آپ ہو گئی ہر ایک دوسرے سے اہرا کر رہا ہے۔ کہ پہلے آپ بنائیے۔ خدا کا شکر ہے۔ ابائے تصفیہ کر ہی دیا۔ ارے بھی مجروح تم سامنے آ جاؤ۔ دیکھا آپ نے میاؤد کے دبلے پتلے انسان مجروح سلطان پوری میں جگر صاحب کے شاگردوں ہی میں نہیں غاشقوں میں ہیں جگر صاحب کس پیار سے مجروح کو دیکھ رہے ہیں۔ مجروح ایک زمانے میں غزل کے شاعر ہوا کرتے تھے ممکن ہے اب بھی غزل کہتے ہوں بظاہر تو وہ خالص فلمی شاعر ہو کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف تخلص مجروح ہے بلکہ غزل کا دل بھی مجروح ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے پڑھنے کا انداز جگر سے لیا ہے۔ تو ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن ہلکے ہلکے کہتے ہیں۔

یہ رُکے رُکے سے آئینویہ گھٹی گھٹی سی آئیں۔ یوں ہی کب تک خدایا غم زندگی بنائیں۔ کبھی جادہ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ۔ تیری آواز نے رُک کر ہیں ڈال دی ہیں بائیں۔ آرزو واہ واہ کے ساتھ دوسری غزل کی فرمائش بھی کر دی گئی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا کہتے ہیں۔

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سمر ہوئی۔ کبھی ایک چراغ جلا دیا کبھی ایک چراغ بجھا دیا۔
 شعر کی اس بے قراری نے تھوڑی دیر کے لئے، نفل کو بھی بے قرار سا کر دیا ڈیر تک تعریف
 ہوتی رہی مجروح اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ ایک منٹ کو سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، آہائے
 غلام ربانی تباہاں کو اشارہ کیا۔ تباہاں ڈیل ڈول رنگ و ردغن سے پورے ٹھکان ہیں جس
 کی جھلک کبھی کبھی اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ تحت الفاظ لڑتے ہیں، توجہ سے سنے کہتے ہیں۔
 بجوم رسم راہ دنیا کی پابندی بھی ہے۔ غالباً کچھ شیخ کو زعم خرد مند ہی مسمیٰ ہے۔
 جملوں سے سازشیں بھی کر رہا ہے آسمان۔ ہم چین والوں کو آستیاں بند ہی ہے۔
 دوسرے شعر پر سب ہی چونک پڑے سازشوں کا انکشاف ہو چکا تھا۔ کئی بار اشعار دوہرائے
 گئے، آہاں اپنی جگہ پہنچ چکے تھے۔

دہلا پتلا میاں قد سلونارنگ نازک ناک نقشہ یہ بے جد شرمائے ہوئے جو صاحب
 سامنے آئے ہیں۔ آپ پہچانتے ہیں؟ جی ہاں یہ اسرار الحق مجاز ہیں۔ یہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں
 کرتے بشرطیکہ پی نہ ہو۔ آج کچھ چھینے ہوئے بھی ہیں۔ کل کیفی صاحب نے جب ابا کا پیام
 ان کو پہنچایا تو انھوں نے کہا تھا، قاضی صاحب کچھ ٹھیک آدی نہیں ہیں نہ تیرے ہیں نہ پلاتے
 ہیں وہاں جا کر کیا کریں گے۔ اور آنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجاز ایسی بات صرف پی کو ہی کرتا ہے
 مجاز کے سامنے آتے ہی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا اعتراف سناؤ کسی طرف سے
 ازا آئی تعارف پہنچا چاہئے۔ ان کے دوستوں نے کہا مجاز آوارہ سناد اور مجاز ستانے لگے
 ہر طرف سے ذاد مل رہی تھی۔ لیکن مجازیوں سنا رہے تھے۔ جیسے وہ خود نہ سوں ان کا یہ کارڈ لکھا ہو۔
 جب اس موڑ پر پہنچے کہ:

راستے میں رک گئے دم لے لوں میری عادت نہیں۔ لوٹ کر چلا جاؤں میری فطرت نہیں۔
 اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں۔ اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں۔
 تو ساری محفل جھوم اٹھی۔ آہ۔ آج مجاز ہم میں نہیں اس کی وحشت دل نے اس کو جینے نہ دیا۔

اگر وحشت کچھ صبر سے کام لیتی تو خدا جانے مجاز شعر کی کن بلندیوں تک پہنچتا۔ اس کے بعد ایک غزل سنائی جس کا ایک شعر پوری غزل پر بھاری ہے۔

یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں تجھ کو فکر ہے اے ساقی۔ محفل تو تری سوسنی نہ ہوئی کچھ اٹھ لی گئے کچھ ابھی گئے۔ کاش مجاز کو اندازہ ہوتا کہ اس کے جانے سے محفلیں کتنی سوسنی ہو گئی ہیں۔ اس کو کیا خبر کہ بہت سے آنے والوں میں ایک بھی تو ایسا نہیں جو محفل میں اس کی جگہ لے سکے۔

ان کے بعد قمر غفر سردار جعفری کے نام پر پڑا۔ درمیان سے کچھ اونچا تر پھر سردار بدین اگھلتا ہوا رنگ بال منہتر حال پریشان اپنے حیلے سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن انگھوں میں غم کی چمک ہاتھوں میں عزم و اصرار کی جھلک بخیرید شاعری کے رسیاں ہیں۔ لیکن چونکہ محفل پر غزل کا رنگ چڑھ چکا تھا، ماحول کی مناسبت سے انھوں نے بھی غزل چھڑ دی۔ یہ تحت اللفظ اڑ پڑے ہیں۔ ایک ایک لفظ کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ عشق کی تپش کا احوال انھیں سے سنئے۔

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم۔ اپنے غم کی آغ سے پتھر کو بگھلاتے ہیں ہم جاگ اٹھتے ہیں تو سوسنی پر بھی نیند آتی نہیں۔ وقت پر بجائے تو انگاروں پہ سوجاتے ہیں ہم دفن ہو کر خاک میں بھی دفن رہ سکتے ہیں۔ لالہ و گل بن کر ویرانوں پہ چھاتے ہیں ہم غزل کی آڑ میں بہت کچھ کہہ گئے۔ سمجھنے والوں نے خوب خوب داد دی۔ سردار جعفری کے ہونٹوں میں سگریٹ پہنچ چکا تھا۔ غزل کے نئے پن نے محفل کو ایک راہ سجھادی تھی۔

قوی غلوں کا سلسلہ رکاتو کنی صاحب آگے کھسک آئے۔ کھسک کھسک کھالفاظ انھیں پر چڑھتا ہے جی چاہتا ہے ان کو سمجھو کر رکھ دو جب دیکھو نیند کی کیفیت طاری ہے۔ بال ہیں کہ انگھوں میں گھس جاتے ہیں۔ اتنا نہیں ہوتا کہ ہاتھ سے پٹائی کے بال ہی بٹاریں۔ لطف تو یہ ہے کہ یہ اس زمانے میں یہ نہیں تھے لیکن پہلی بار دیکھنے سے یہ گمان ہوتا تھا کہ نہ صرف پیسے ہوئے ہیں بلکہ چمکھلے ہوئے ہیں۔ دبے پتلے لمبا قد چھوٹی چھوٹی انگھوں میں غضب کی چمک اب جو یہ سامنے آئے

تو مجھے یہ خیال آیا کہ اس قدر بچہ لانا خدا جالے آواز نکالنے کی بھی رحمت والا ہے۔ کیا نہیں ہمیں
 صاحبِ دہ توجہ سنانے پر آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ساری جیتی امتحان سنانے ہی کے لئے محفوظ کر رکھی
 تھی۔ ان کا نظم کا عنوان تھا ”نئی جنت“ کہتے ہیں۔

اسٹ کو ایک ٹھوکری میں ستم کا راج رکھ دیں گے۔ اٹھا کر اپنی بیٹی کو چھو معراج رکھ دیں گے۔
 وہ اک لگی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا۔ ہم اب کی غنی غنی کی جیس پر تاج رکھ دیں گے۔
 ہم اب کی تکیے تکیے کو چھو بند کی سکی میں گئے۔ ہندو متناہ میں ہم نئی صفت بنائیں گے۔
 عزم و ارادے کو انداز بیان نے جاہلیانہ لہجہ دیئے۔ آج کو بظاہر وہ جسمانی طور پر مغلوب
 ہیں لیکن عزم و ارادے اسی طرح مضبوط ہیں۔

ان کے بعد پریم دھوون نے گیت سنائے جو میرے ذہن میں نہیں ہیں لیکن بول بڑے
 سچے اور سُریلے تھے۔ فلموں کے ذریعے گیت سننے کو مل جاتے ہیں لیکن ان کی زبانی سننے کا
 لطف کچھ اور ہی تھا۔

ان کے بعد سائر لکھنوی آگے بڑھے۔ اس وقت ایسے مشہور تو نہ تھے البتہ
 شہرت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ انھوں نے کئی چیزیں سنائیں۔ ایک ہند اس زمانے
 میں بہت مشہور ہوا تھا کہتے ہیں۔

اک شہنشاہ نے دولت کا مسہارائے
 ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
 میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بھی کوئی بُرا مانے یا بھلا میں نے یہ سنا تو خیال آیا کہ عجب جل جگر شاعر ہے۔ محبت سے دولت
 کر کیا ہو گا۔ محبت کی دونوں جگہ حکمرانی ہندوستان کے ایک عظیم شاہکار پر آنا بڑا بہتان شاعر
 کی سب سے زیادہ دولت کے سہارے اگر تاج محل تعمیر ہوا تو تعمیر کے پائے کتنے گھروں کے چرند و شمشیر
 ہو گئے۔ شاعر یہ بات بھول کیوں کیا۔ خیر اپنا اپنا خیال ہے۔

ان کے بعد کئی اسکندر علی و جہد شریف لائے۔ اپنی وضع قطع اور لغات کے اعتبار سے

یہ دوسرے شاعروں سے ذرا الگ ہیں۔ جدید شاعری سے ان کے تارے نہیں ملتے۔ نظم اور غزل ان کا میدان ہے۔ دیکھتے ہیں بہت نازک اور اندازہ کہتا ہے۔ کہ آواز بھی اسی مناسبت سے ہوگی لیکن جب سنائے پر آئے تو میں نے چپک کر ادھر ادھر دیکھا کہ یہ گرجدار آواز کہاں سے آئی۔ ارے یہ تو وجد صاحب ہی پڑھ رہے ہیں ترنم سے پڑھتے ہیں بڑے یقین سے کہتے ہیں۔

مہنت کے چرخوں سے روشن ہر راہ گذر ہو جاتی ہے و پر غم نگاہ راہ رواں سا جان سفر ہو جاتی ہے۔
دل رنگ بدلتا ہے پیغم چھٹتا ہے غبار شادی و غم و ہو وصل کی شب باہو کی شب کس سفر ہو جاتی ہے۔
اسے چتا ہوا آفتاب کی صورت کیا ہوگی و دل اور پریشان ہوتا ہے تسکین اگر ہو جاتی ہے۔

رنگ غزل اور وجد کے ترنم نے مل کر محفل پر وجد کی کیفیت طاری کر دی۔ ان کے بعد یہ دیکھ کر کہن سا سننے آیا۔ المباد، دبترنگ، کھڑا ناگ، نقشہ سگریٹ کی کثرت ہے۔
ہونٹ سیاہ، لمبے لمبے، تر تیب بال، چنگیجے سے بدھسی لباس میں منہ الص وہ سی دل کا لاک
کچھ سمجھ، جی ہاں یہ میں مخدوم محی الدین اس زمانے میں نوجوان شہر میں ان کا شمار تھا۔
دو شالے کی جگہ "شرح پرچم" نے لے لی ہے۔ اب یہ عوامی شاعر تھے۔ ان کا انداز ترنم بھی خوب تھا۔
جب ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی تو ترنم کی شرط بھی لگائی جاتی، انھوں نے اس محفل میں مہنایا تو بہت کچھ لیکن ابائی فرمائش پر یہ چند شعر سنئے کچھ سوال میں بن پڑے تو جواب دیئے کہتے ہیں۔

گہریاں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا۔ تہری آنکھوں سے آنسوؤں کے دھل جاؤں تو کیا ہوگا۔
جنوں کی لغزش خود پردہ دار راز الفت ہیں۔ جو کہتے ہو سبھل جاؤ سبھل جاؤں تو کیا ہوگا۔
نہ جانے سبھل جاتے تو کیا ہوتا! کس قدر عجیب بات ہے کہ اب ہم نہ ان سے
کرتی فرمائش، مگر سبکس گے اور نہ ہی شرط لگاسکیں گے۔ جب ان کا ساٹھ سالہ جشن سنایا گیا تھا۔
تہ میں نے سوچا تھا جب مخدوم صاحب اسی سال کے ہوں گے تو ساٹھ سال کے نظر

آئیں گے مگر وہ تو نوجوان ہی چل رہے۔

ذرا ان سے بھی مل لیجئے چھوٹے سے قد کا بال نکھائے منہ میں پان دبائے ضرورت سے زیادہ سعادت مند نظر آئے والا کوئی جانا پہچانا تو نہیں؟ یہ میں شاہد صدیقی ان کو بھی ہم روچکے ہیں یہ اس زمانے میں ترنم سے لڑھکتے تھے اور جگر کے ترنم سے متاثر تھے۔ آخر زمانے میں ترنم ترک کر دیا تھا۔ ان کو جاننے کے لئے دو شعر ہی کافی ہیں کہتے ہیں۔

کبھی دل نے راہ غم میں بہت اٹیک خود دبائے۔ کبھی وہ مقام آیا کہ حیات مسکرا دی

یہ غروب بے حقیقت یہ سرو بے لطافت۔ مجھے آج تو نے سلف کوئی اور شمع پلا دی

ترنم نے غزل کو بالکل ہی غزل بنا دیا۔ شاہد کی موت اور ادب کے لئے ایک حادثہ ہے۔ جس کی تلافی موجودہ دور میں ناممکن ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ شاہد اب کبھی کسی محفل میں نظر نہ آئے گا تو اس پر غصہ سا آتا ہے۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے پھر آخر ایسی جلدی کیا تھی سکون سے جاتا تو کیا تھا۔

شاہد صدیقی کے منہ میں گلوری پہونچی اور۔۔۔ فضل الرحمن صاحب کی باری انکی یہ کسی طرف سے بھی شاعر نظر نہیں آتے جب سامنے آئے تو یقین نہ آیا لیکن جب سناتے لگے تو ماننا پڑا کہ شاعریوں بھی ہوتے ہیں اس دن موڈ میں تھے اور نہ بھی ہوتے تو فضا کچھ ایسی تھی کہ موڈ بننے کی تندرستی دیر لگتی دوڑوں کا ناچ نہ دیکھا ہو تو ان کے الفاظ میں دیکھ لیتے ہیں۔

یہ شگوفے حسنیوں کی جن میں ادا — یہ نسیم کا رقص یہ موج صبا
یہ پرندہ پیت کے مارے ہوئے — نہیں بچھی پریم کی جن سے انگن
یہ سہلہ نظارے یہ سیاری زمین — وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ ریا — وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سہجی

فضل الرحمن صاحب تخت اللفظ لڑھک رہے تھے لیکن الفاظ میں غصہ کا لوج اور آوازیں ترنم جیسی لچک نے کچھ عجیب ڈھنگ پیدا کر دیا تھا۔ جس کو نہ

ترنم کہہ سکتے ہیں نہ تحت اللفظ بہر حال دونوں کے درمیان جو بات بھی تھی خوب تھی جب وہ
 وہ کا شعور دھیمپلا تو ایک چلک وار آواز آئی ”واہ میاں واہ لطف آگیا ایسا معلوم ہوا
 جیسے آغا شاعر ہو گیا ہو یہ آغا چاچی کی آواز تھی ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔ فضل الرحمن صاحب
 بڑی احتیاط سے اپنی جگہ نہ ہلکے ہیں۔ سب کی نظریں جگر صاحب پر ہیں۔ مگر یہ کیہ یہاں تو مراد آبادیوں
 یوں کے درمیان کچھ سرگوشیاں ہو رہی ہیں سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ قاضی صاحب کے چہرے
 کارنگ ہوتا رہا ہے کہ ”بڑے پھنے“ اور کچھ شرمائے سے بھی ہیں جگر صاحب نے ابا سے بھی سناتے
 کی فرمائش کر دی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابا نے کبھی کسی محفل میں کلام نہ سنایا تھا بلکہ سچ
 پوچھتے تو آج سے پہلے مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ ابا شعر کہتے ہیں اور اپڑھتا جا رہا ہے ابا کو
 ہتھیار ڈالنا ہی پڑے یہ بچے مسکراتے ہوئے سامنے آبی گئے۔ جگر صاحب کی توجہ چاہتے ہوئے
 گویا ہونے والی کئی کہانی کو ختم کرنے کی اس نرالی خواہش کی داریہ لگے۔

کہانی دل کی آخر ایک شب یوں ختم ہو جائے۔ کہ جیسے طفلِ ناداں روتے روتے تھک کے جاوے
 کہیں سے ایک شب اے چشمِ گریہ تجھ کو تولادے۔ وہ ایک آنسو جو نقشِ زندگی کو اکے دھو جائے
 عملِ فطرت کا ہے اس جلوہ گاہِ دہر میں ایسا۔ کہ لبسِ اک لمحہ کھولے آنکھ غنیمت اور سو جائے
 قریبِ زندگی راہِ محبت سے نہ بھٹکادے۔ متاعِ زخمِ دل اس کی امانت ہے نہ کھو جائے
 غزلِ ختم ہوئی بڑی دیر تک دلو ملتی رہی اور لہانہ جانے کہاں دورِ خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتے

۱۵۰

اب جگر صاحب کے پیٹھ میری باری آئی جی میں نہیں میرا مطلب جگر مراد آبادی سے ہے
 یہ دیکھتے پسیرے پوچھتے ہو جگر صاحب سامنے آگئے ان کا ہر انداز شاعرانہ ہے۔ ٹوپی سے باہر
 نکلی ہوئی بالوں کی لٹ یہ بھی ایک ادا ہے۔ کچھ کچھ سفید ہو چلی ہے عجب نہیں کہ دھوپ
 سے سفید ہو گئی ہو۔ یہ نہایت سنجیدہ انسان ہیں خصوصاً جس محفل میں خواتین ہوں ان کی متانت
 اپنی حدوں سے گزر کر بوجہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ دیکھتے ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔

سب ہی ہمہ تن گوش میں۔ حسبِ عادت جگر صاحب پہلے کچھ ننگناٹے پھر منہ ہی منہ میں الفاظِ ترنم میں دوہرائے لپیچے، وہ ترنم سے پڑھنے لگے جذبہ بے اختیار کے کرشمے انھیں کی زبان سے نکلتے ہیں۔

کامِ آخر جذبہ بے اختیار ہی گیا۔ دل کچھ اس صورت سے تڑپاں کو پیارا ہی گیا ہائے یہ حسنِ تصور کافر ب رنگِ دیو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہا رہی تھی۔ شاہد اور بحرِ کالبد میں تینوں چمٹا کہ کس طرح ان کی بلائیں لے لیں، ایک سما بندھ گیا ایک کے بعد دوسری غزل چھڑتی رہی، آخر غزل کے اس شعر کا کیا کہنا:

اے محبتِ نہ پھینک مہرے محبتِ نہ پھینک — ظالمِ شراب ہے اور ہے ظالمِ شراب ہے۔
کتنا سادہ اور بے ساختہ شعر ہے، ایک طرف التجا اور خوشامد دوسری طرف کوفت اور ہنچھلاہٹ کا اظہار سبحان اللہ سنگِ دل محبت کا دل بھی موم ہو گیا ہوگا۔

جگر صاحب کے کلامِ مشاعرہ اختتام کو پہنچا ہوا ہے گھر کی شاید یہ آخری محفل تھی جتنی ہوں اس جن کے کتے ہی پھول مہ جھانگے، قاضی صاحب، جگر، مجاز، شاہد، مخدوم، انعامیاد، اب کبھی جیتی جاگتی محفلوں میں شریک نہ ہو سکیں گے، یہ کتنا تکلیف دہ خیال ہے لیکن اس خیال کی تسلی کو یادیں کیا کچھ کم ہیں۔

اب یادِ فنگاں کی بھی ہمت نہیں رہی

یادوں نے کتنی دور بٹائی ہیں بسیاں



رضیہ سجاد ظہیر

رضیہ آپا سے کتنی یادیں وابستہ ہیں ان کا حساب رکھنا آسان بات نہیں جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو سترہ کا وہ زمانہ نظروں میں گھوم جاتا ہے جب میں کرامت حسین گریز کالج میں پڑھا کرتی تھی اور رضیہ آپا ہمیں اُردو پڑھاتی تھیں کیسی بے چینی سے ہم ان کے گھنٹے کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے دل و دماغ پر سحر کر دیا ہو۔ انداز بیان اتنا خوبصورت تھا کہ ایک ایک لفظ ذہن میں پیوست ہوتا چلا جاتا گھنٹہ ختم ہو جاتا اور ہم لوگ سحر زدہ سے بیٹھے رہ جاتے۔

رضیہ سجاد ظہیر بڑی حوصلہ مند خاتون تھیں ان کے میاں کے حصے میں شہرت آئی اور ان کے حصے میں سختیاں۔ اس وقت وہ تین چھوٹی بچیوں کی مال تھیں اور معاشی الجھنوں میں گرفتار۔ لیکن جس طرح تنہا رہ کر مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا اس کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔ نہ تو کبھی بچیوں کو کسی کمی کا احساس ہونے دیا اور نہ ہی دنیا والوں کو یہ معلوم ہو سکا کہ ان پر کیا گذر گئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بہت خوددار تھیں بلکہ دکھڑا روئے والوں کو بزدل کہتی تھیں۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا ان کی عادت تھی۔ اور اسی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی نے ہمیشہ ان کی محرومیوں کی پردہ پوشی کا رول ادا کیا۔ ایک عرصے تک انھوں نے ایک چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے میں گذر کی (مجھ یاد پڑتا ہے ان کی زندگی کے اس دور کو کہانی کی شکل میں کسی رسالے میں پڑھا ٹھیک سے یاد نہیں کہ افسانہ نگار کوٹھ

ممکن ہے باقمر مہدی رہے ہوں جن کو وہ بیٹا کہا کرتی تھیں) کالج سے کچھ وقت پہلے
 انھیں تنخواہ نہیں ملی مالی دشواریوں کا ہمیشہ سامنا رہا لیکن اپنے خوش حال عزیزوں
 کے سامنے ہاتھ پھیلاتے کسی نے نہیں دیکھا اب ہر حال اس کو ٹھہری سے
 نکلیں تو ان کے حصے میں سسرال کی وزیر منزل کے شاگرد بیٹے (OUT HOUSES)
 آئے جن کی اکثر کھرباں اور دروازے بے کواڑ تھے۔ یہ بات سن کر یہی ہے جب میری
 بہن وزیر منزل کے سامنے ولے مکان میں رہتی تھیں اور میں ان سے ملنے گئی
 ہوئی تھی جس دن میں وہاں پہنچی اسی شام رضیہ آپا سے ملنے گئی تو انھوں نے یوں
 مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا جیسے بچھڑی ہوئی بیٹی مل گئی ہو اس کیفیت کو ابھی
 محسوس تو کر سکتی ہوں میں مگر الفاظ نہیں دے سکتی! اس زمانے میں رضیہ سجا ظہیر کو بہت قریب
 سے دیکھنے کا موقع ملا کالج سے جب شام کو گھر آ کر کھانا پکانا دھونا دھلانا بچوں کے
 ساتھ بیٹھ کر ان کی پڑھائی میں مدد کرنا ان کا معمول تھا اور جب رات کو فراغت پا جاتیں
 تو کاغذ قلم لیکر بیٹھ جاتیں۔ کبھی میں پہنچ جاتی تو وہ جو کچھ تھیں اصرار کر کے سنتی کبھی وہ ہمارے یہاں
 آ جاتیں (دونوں گھروں کے بچوں میں ایک بٹی سی مرک تھی) اور اپنی کوئی نہ کوئی کہانی ہم سب
 کو سناتیں۔ سجا ظہیر صاحب یوں تو پاکستان سے آچکے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت
 لکھنؤ سے باہر ہی گذرتا تھا اس لیے میرا ان سے صرف اتنا ہی تعارف تھا کہ میں قاضی صاحب

کی لڑکی ہوں۔!

اس زمانے میں رضیہ آپا جو تھے بچے کی تیاری میں تھیں میں دو ماہ لکھنؤ میں گذر کر
 حیدر آباد آ گئی پھر میں نے سنا کہ رضیہ آپا بھی ملازمت چھوڑ کر دیلی چلی گئیں اتفاق سے میرا دیلی
 جانا ہوا تو میں ان سے ملنے گئی۔ وہ محلہ ”حوص خاص“ میں رہ رہی تھیں بیمار تھیں بہت
 ڈبلی ہو گئیں تھیں مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیئے میں ان کے سینے سے لگ گئی
 انھوں نے بتایا کہ شکر آئے گی ہے خون کا دباؤ بھی بڑھ گیا ہے حال سن کر دل کو بڑا دھکا لگا۔

لیکن اللہ نے فضل کیا - اور وہ پھر اپنے مشاغل میں منہمک ہو گئیں۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ رضیہ آیا کو سا ہتھیہ الیڈمی کے خواتین کے سینما کے سلسلے میں حیدر آباد آتا ہوا وہ صرف چار دن کے لئے آئیں اور میرے پاس ٹھہریں۔ یہاں ان کے چاہتے والوں کی کمی نہ تھی سب ہی ان کو اپنا جہان بنا تا چاہتے تھے لیکن سب انہوں نے ایک ہی بات کہی کہ ”بھئی یہ تو میری بیٹی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں حیدر آباد آؤں اور اس کا گھر چھوڑ کر کہیں اور ٹھہروں!“

وہ دن اور ان دنوں کا ایک ایک لمحہ دہن میں یوں محفوظ ہے جیسے البسم میں تقویٰ ہیں۔ بس البسم کھول کر بیٹھ جائیے۔ یہ رہا اردو مال اردو مجلس نے رضیہ آیا کے اعزاز میں ادبی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ رضیہ آیا کا کہنا تیاں سنانا اور سامعین کی وقفہ وقفہ سے واہ واہ کی صدائیں اور کہانی ”بیرونیوں کا دیس“ مال میں سنا سب ہمہ تن گوش کہانی کے انجام کے منتظر۔ اکاش ایرا ہو سکتا کہ وہ تنہی سی جان پیروں کے دیس سے بھٹک کر کسی گوشے سے رضیہ کا روپ مہارن کر کے نکل آتی۔!

دن بھر ملنا جلنا اور ادبی اجلاسوں میں شرکت۔ رات کو کھانے کے بعد میرے کسٹ لڑکے کو کہانیاں سناتیں آپ نصرت کو ان کا چہرہ یاد نہیں ہے لیکن کہانیوں کا لطف آج بھی یاد ہے فرض 24 اپریل سے 28 اپریل تک کے وہ چند دن یادگار بن گئے۔

مجھے خط میں لکھا ”حیدر آباد سے آنے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر کیا کریں کہ یہ طرہ طرح کے احاطہ ارضی و سماوی پھلے ادنیٰ کا پیچھا نہیں چھوڑتے“

رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند بھی تھیں روشن خیال بھی لیکن ان کے پاس کچھ حدیں مقرر تھیں اچھی روایات اور تہذیبی قدروں کا انہیں بڑا پاس تھا اور ان کا دل سے احترام کرتی تھیں۔ مجلسوں میں پھلے ہی نہ جاتی ہوں مگر ماہ محرم کا احترام پوری عقیدت کے ساتھ کرتی تھیں بزرگوں کے طور طریقوں اور خیالات کی عزت اور ان کی خوشنودی کو اپنا مقدس فرض سمجھتی تھیں رضیہ آیا

کے گھرانے میں میرے کی بڑی پابندی تھی شادی کے بعد میرے سے باہر آئیں لیکن جب نکلان کے والد حیات رہے وہ میرے جائیں تو اسٹیشن پر برقعہ پہن کر ہی اترتیں۔ اور جب تک رہتیں میرے کا ہتھام کر تیں۔ لیکن ان روایات کو کبھی کسی پر لادنے کی کوشش نہیں کی ان کی ہم عمر خواتین میں زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے نہ صرف پرانی روایات کو توڑا بلکہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ رضیہ آپا نے اس بغاوت پر اعتراض بھی نہیں کیا اور اپنا دامن بھی بچائے رکھا۔ یہی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دی صحیح اور غلط کا فرق بھی سمجھایا ساتھ ساتھ ان کو یہ اختیار بھی دیا کہ اپنی زندگی کے راستے خود تلاش کریں۔

۱۹۶۶ء میں دہلی میں رضیہ آپا سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ صحت کافی خراب ہو چکی تھی خون کے دباؤ اور شکر کی زیادتی نے ان کے چہرہ پر درہ علامتیں پیدا کر دی تھیں جو آخری سفر کی تیاری پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ آنکھوں میں پر غوصی سیار جھلک رہا تھا ہونٹوں پر کھل کھلاتی ہنسی بھی تھی لیکن ان کے قدم تھکے تھکے سے تھے جیسے کچھ رسی ہوں۔

ہو چکی غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور بے

اُن سے کئی کئی سال ملاقات نہیں ہوتی تھیں لیکن ایک اسید تھی کہ آج نہیں ٹوکل ملاقات ہو چکی جائے گی لیکن موت کے آگے سب مجبور ہیں۔ رضیہ آپا آنکھوں سے ادھیل گئیں لیکن ایسی ہستیاں پھولوں کی طرح ہوتی ہیں جو مر جھانے کے بعد بھی اپنی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر اور احوال کو بہکا کر رہتی ہیں۔ چنانچہ رضیہ آپا نے اپنی یادوں کے علاوہ "سیمن" "کانٹے" اور "اللہ نھوے" جیسے ناول اور کہانیاں چھوڑی ہیں کئی تراجم بھی ان کی یادگار ہیں جو انھوں نے مختلف زبانوں کی مشہور کتابوں سے اردو میں منتقل کئے ہیں۔ ان کی تحریروں کی زبان ہلکی پھلکی۔ رواں اور شائستہ ہے ترجموں پر بھی اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں چونکا دینے والی بات بہت کم ملیگی اس کے برعکس دیہی دیہی سلگتی جھکتی ایسی روشنی ملتی ہے جو انسان کے اندر کی

بھی ہوئی انسانیت کو آہستہ آہستہ بیدار کرتی ہے

بہت کم تقاروں نے رفیہ سجاد ظہیر کے ادبی وجود کو وہ مرتبہ دیا جس کی وہ مستحق تھیں لیکن تعویض
زندگانی کی فی طلب رفیہ آیا کو بھلا اس کی فکر کیوں ہونے لگی کہ اوروں سے انھیں کیا ملا اور کیا
نہیں ملے یا وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے دیئے جاؤ کہ دینے والا ہی سرفراز
ہے بے شک رفیہ آیا کی یادیں صد سرفرازیں گی۔

رفیہ آیا نے عمر کا وہ حصہ جس میں فراق کا تصور بھی جان لیوا بن جاتا ہے فراق و انتظار کی
بھول بھلیوں میں بھٹکے ہوئے گزارا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب فراق و انتظار کی گھڑیاں
ختم ہوئیں اور ملن کا موسم آیا۔ لیکن دائیہ قسمت کہ سجاد ظہیر صاحب کی اچانک موت نے ان کو
بھردہیں لاکھڑا کیا جہاں سے وہ جیس تھیں اور اب دائمی فراق کی گھڑیاں سامنے تھیں جس میں نہ
انتظار کی کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی امید کا سہارا۔ جب تک جیتی رہیں غم سہائی ان کی مونس و
غملگا رہی یہ غم ان کے اپنے تھے اس میں انھوں نے کسی کی ساجھے داری لیندہ کی اور بھرہ اڈیمبر
۱۹۷۹ء کو دئی میں چپکے سے اپنے غموں کو سینے میں سمیٹے دنیا سے منہ موڑ لیا۔

سیمان اریب

کس قدر ایرانیات ہے جب میں نے اویب صاحب کو دیکھا تھا۔ دُبِلے پتکے دراز قد۔ لمبے سنہری بالوں کی لٹ بیٹھائی پر پڑی ہوئی۔ شیروانی میں بیس خالص دکنی شاعر معلوم ہوتے تھے۔ ابانے ایک چھوٹی سی محفل شعر سچائی تھی۔ غالباً جگر صاحب کے اعزاز میں یہ اہتمام کیا گیا تھا اس محفل میں اویب صاحب نوجوان شعراء کی نمائندگی کر رہے تھے۔ عجیب اتفاق ہے آج جب میں یہ لکھ رہی ہوں تو اس محفل کے تمام شاعر مرحوم ہو چکے ہیں۔ اور محفل شعر کا اہتمام کرنے والا بھی !

اس محفل کے بعد اویب صاحب سے ملے جلتے کا سلسلہ قائم ہوا تو مرتے دم تک بعد جب کبھی اباحیدر آباد آتے یہ سب نوجوان شام ان کے گرد جمع ہو جاتے ایسے موقعوں پر اویب صاحب کی تھریا کے مگر ٹوں پر رہتی رخصت ہونے لگتے تو سگریٹ پر جمرانا کبھی نہ بھولتے۔ !! چوری دم سب کے سامنے دیدہ دلیری کے ساتھ ہوتی قاضی صاحب بھی دیکھ کر نظریں جمر لیتے جیسے کہہ رہے ہوں ! اٹھا تو زندگی کا لطف یہ دن باریار پلٹ کر نہ آسکے۔ !

اویب صاحب نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ انشا پر دواز بتے بستے شاعری پر اتر آئے اور شاعر بن گئے جوش میں آئے تو ”مجاہد تلنگا“ کچھ ڈالی اور سکون سے دو سال۔ حیل میں کاٹ دیئے۔ طبیعت کی بے قراری نے مصافت کے رنگستان میں لاپیشکا۔ کبھی جمہور کی مصافت کی تو کبھی ”جہراغ“ کی ایڈیٹری سنبھالی۔ سب اس کے ادارہ کچھ پھر اپنا ذاتی ماہنامہ ”صبا“ نکالا اور اسی کے ہوئے۔ اب ”صبا“ ذریعہ معاش بھی تھا اور تسکینی ذوق

کا ذریعہ بھی۔ لیکن جہاں تک محاش کا تعلق تھا دیکھا گیا کہ کبھی ادیب ”صبا“ کو کھا رہے ہیں اور کبھی ”صبا“ انہیں کھا رہا ہے اس کشمکش میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خریدار کم ہو گئے اور اشاعت نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ لیکن ادیب صاحب نے ہار نہیں مانی وہ صبا کی بقا کے لئے حالات سے جنگ کرتے ہی رہے۔ ”صبا“ نے بہت جلد اپنا ایک مقام بنالیا تھا باوجود یا بندی سے متعلق نہ ہونے کے اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جہاں اپنے وقت کے مشہور کھنے والوں کی تخلیقات ”صبا“ کے اعلیٰ معیار کی گواہی دیتی ہیں۔ وہیں ”صبا“ نے نئے کھنے والوں کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور آج صبا کی بدولت کئی کھنے والے ادیب میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکے ہیں۔ صبا کے ادیب صاحب نے اردو کے کھنے والوں کیلئے جو کام کیا ہے وہ ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

اب کے استقلال کے بعد بھی ادیب صاحب سے ادبی محفوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن صفیہ سے شادی کے بعد ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں۔ مخدوم صاحب کے تقریباً چلے میں ادیب صاحب سے ملاقات ہو گئی کینز کے پہلے حملے سے کچھ دن پہلے حملے سے بچ گئے۔ گلہ میں غفلت لپٹا ہوا تھا باتوں کا سلسلہ مخدوم صاحب سے شروع ہو کر ان کی صحت تک پہنچا اور پھر موت و زندگی کا فلسفہ چھڑا تو ادیب صاحب نے ایک بہت ہی عجیب واقعہ سنایا۔ کہنے لگے ”شاہد (صدیقی مرحوم) کا ایک مہاجر سیٹھ بڑا بڑا سراپنا ہوا ہے ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میں (ادیب) مخدوم اور شاہد ایک سفر میں ملاتھے تھے واپسی میں شاہد کا مہاجر سیٹھ مخدوم کے پاس رہ گیا اور چند دن بعد شاہد کا استقلال ہو گیا وہ سیٹھ مخدوم کے پاس پڑا رہ گیا ہم لوگ بھول بھول گئے۔ اتفاق دیکھو کہ ایک دفعہ پھر مخدوم کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنا تو اس سیٹھ کا خیال آیا اس سفر میں وہ پھر ہم سے ساتھ ہو گیا۔ واپسی میں وہ سیٹھ اتفاق سے میرے سامان کے ساتھ آ گیا۔ اور چند دن بعد مخدوم بھی محلِ بسے۔ اب صفیہ بہت گھبراتی ہوئی ہے اس کا خیال ہے کہ فردر اس سیٹھ میں کوئی بات ہے پھر ہنس کر کہتے لگے میں نے طے کر لیا

ہے جس دن زندگی سے گھر اجاڑ لگا اس اسٹینڈ کو نکال کر باہر پھینک دوں گا میں نے کہا ایوب صاحب
 قصول باتیں مت کیجئے یوں ہی محذوم صاحب نے بلا کر رکھ دیا ہے خدا نہ کرے اب کوئی ایسی
 بات سنتی پڑے !! اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی لیکن ایوب صاحب کے جانے کے بعد کبھی کبھی
 خیال آتا ہے کہ کیا واقعی ایوب صاحب نے وہ مراحی اسٹینڈ پھینک دیا ہوگا؟ میں ایسی باتوں پر
 یقین تو نہیں رکھتی لیکن بعض حالات کچھ ایسے بن جاتے ہیں کہ فیضع التقادی کا غلبہ ہوتے
 مگلتا ہے۔

ایوب صاحب تھے تو بہت باتوں لیکن انداز گفتگو اس قدر شگفتہ اور جاندار تھا کہ
 گفتگو سنائیے۔ زندہ دل ایسے کہ قیامت بھی گزر جائے تو پیشانی پر ہل نہ آتا۔ کبھی یقینی وہ بہت
 کھڑے انسان تھے خوشامد اور چالیو سی ان کے بس کی بات نہ تھی اور انسان ہونے کے ناتے یہ اتنی
 سب سے بڑی کمزوری تھی کوئی بات بری ملتی تو صاف صاف اظہار کر دیتے کھری کھری منا کر دل
 بکا کر لیتے اور پھر یوں ملتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تھریر ہو یا تحریری ان کی یہی صاف گوئی
 ان کے لئے وہاں جان بن جاتی۔

کبھی کبھی طنو شہی بر آتے تو ہم کے ہم لڑھا دیتے اور اکثر بے قابو ہو جاتے کچھ لوگ ان کی اس
 حرکت پر ناک بھویں جڑھالتے سچ یوچھے تو برائی تو برائی ہے فرق مرق اتنا ہے کہ کسی ریس کے
 دیوان خانے میں برائی اعلیٰ سوسائٹی کی علامت بن جاتی ہے اور کسی غریب کے جھوپڑے میں باعث
 ملامت ایوب صاحب پیامے انسان تھے با اخلاق یا مروت وضع دار اور دوستوں پر جان
 خدا کرنے والے۔ ایسی خوبیوں والا صوبہ لیجئے کہ کیسا شوہر ہوگا اور کیسا باب۔ اس جون میں دہلی
 سے واپس آئی تو معلوم ہوا ایوب صاحب پھر بیمار ہو گئے ہم دونوں مزاج پر سی کے لئے گئے
 تو وہ چند اجاب کے ساتھ رہی کھیل رہے تھے ہم لوگوں کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور
 ہمیں ساتھ لئے کمرے میں آئیے بیٹھے۔ کہتے گئے اب خبری ہے میں نے بتایا کہ دہلی گئی ہوئی تھی
 عالم علی کی طرف اشارہ کر کے بولے آپ تو تھے !! لیجئے میں شکایت اور شکایت میں اس

بلا کی ایسا نیت تھی کہ کچھ جواب دیتے بن نہ پڑا۔

کافی دے دیے ہو گئے تھے گردن میں ایسی اڑا گئی تھی کہ آزادی کے ساتھ جیش نہ دے سکتے تھے بات کرنے میں بھی تکلف ہوتا تھا مسلسل بات کرتے رہے بیماری کا حال تو ایسے مناسب تھے جیسے کوئی لطیف بیان کر رہے ہوں۔ عالم علی کو اصرار کر کے سگریٹ بلایا کہتے گئے مجھے خواہش نہیں ہوتی لیکن دوسروں کو پیسے دیکھ کر خوشی بہت ہوتی ہے۔ صفیہ نے بتایا کہ ایک دن صفیہ کو سامنے بٹھا کر زبردستی بریانی کھلائی اور ایسا لطف اٹھا رہے تھے جیسے خود کھا رہے ہوں۔ غرض ہم لوگ کافی دیر ان کے ساتھ رہے چلنے لگے تو گیٹ تک اگر رخصت کیا اور پھر آنے کا وعدہ بھی لیا۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ امیر صاحب ہسپتال میں شریک کر دیے گئے ہیں حالت تارک ہے ہم لوگ عیادت کے لئے نکلے تو یہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے کس حال میں دیکھیں لیکن وہ ہم کو بیٹھے ہوئے ملے بند بند آواز سے ہی سہی خوب باتیں کیں دل نے کہا اس حالت میں بھی رہیں تو کیا بُرا ہے! لیکن اس کے بعد سلسل ان کی حالت بدلتی اور بگڑتی رہی صفیہ جو خود دبا پتھن کی برائی مریض ہے۔ دل اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکا اور پھر گئی اس بار جب ہم ملے گئے تو صورت حال بالکل مختلف تھی میاں بیوی بیلنگوں پر پڑے تھے۔ امیر صاحب کو مسلسل ہچکیوں نے ہلکان کر رکھا تھا۔ لیکن زبان پر کسی قسم کا گلہ شکوہ نہ تھا۔

صفیہ بتا رہی تھی کہ غذا پہنچانے کے لئے ایریشن کے ذریعہ پیٹ میں یوب ڈالتے والے ہیں اس دن پہلی بار میں نے صفیہ کی آنکھوں میں انسوترتے ہوئے دیکھے۔ لیکن صفیہ امیر کی زندگی سے مایوس نہیں تھی اس کو پورا یقین تھا کہ یوب سے غذا پہنچنے کے بعد طاقت آجائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایریشن کے بعد ہم لوگ گئے تو صفیہ سکندر آیا ہسپتال میں مستقل ہو چکی تھی وہ پہلا موقع تھا کہ امیر صاحب ہلکرا کر ہاتھ کی جیش سے سلام لیا بات نہ کر سکے۔ وہاں سے اٹھ کر دو دنوں پر ایک بوجھ تھا ڈر اور اندیشہ تھا چار دن بعد ہی امیر صاحب رخصت ہو گئے

ادیب صاحب اس سفر کی تیاری میں تقریباً دو سال سے لگے ہوئے تھے اس لئے ان کی موت اچانک نہ تھی لیکن بے وقت ضرور ہوئی۔ ان کے حوصلے جو ان تھے کام کرتے کی لگن تھی انھوں نے اپنی بیماری کے بعد ”صبا“ کے ایک شمارے میں لکھا تھا ”مجھے زندگی سے پیار ہے میں جینا چاہتا ہوں“ ادیب صاحب عمر کی اس منزل پر تھے جہاں سے انسان ماضی کے تجربوں سے مستقل کی راہیں ہموار کرتا ہے اور راستے ہموار ہو چکی چلتے تھے گھر گھر ہستی نے کر بیٹھنے کے جو خواب مغیر نے دیکھے تھے اب یورے ہونے کو تھے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے خواب تو خواب حقیقت بھی ایک خواب بن کر رہ گئی۔

ہمارے ملک کا یہ دستور بھی عجیب ہے کہ ٹنکار جب تک زندہ رہتا ہے اس کو مرنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب مر جاتا ہے تو اس کی موت کو ادیب کا ایک عظیم سانچہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے ادیب صاحب کا خیال تھا کہ

میں نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی ہے ادیب

یاد آئے گی زمانے کو میری بے جگری

کیا زمانے نے یاد رکھا؟

قاضی عبدالغفار صاحب نے پہلی مرتبہ حیدرآباد میں حیدرآباد کی اردو صحافت کے وقار و اعتبار کو اونچا کیا اور مستحکم بنایا انھیں کی مساعی کی بدولت اس شہر حیدرآباد میں پہلی مرتبہ انجمن صحافت اور انجمن مدیرانِ جرائد قائم ہوئی۔ (جناب اختر حسن صاحب)

مید کا زوان

جناب حبیب الرحمن صاحب

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ پہلی بار بابا (حبیب الرحمن صاحب) کو کب دیکھا تھا ہو سکتا ہے سن ۱۳۴۵ء کی بات ہو۔ ہمارا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ دنیا دمانیھا سے بے خبر۔ بقول حالی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ لاٹ صاحب بھی آجائے تو بلیٹ گرتہ دیکھے کہ جیسا کون ہو۔ ۹۱۱ پھر بابا کے ملنے والوں کا دائرہ بھی اس قدر وسیع تھا کہ اگر کوئی شش بھی کرتی تو سب کو نہ پہچان پاتی۔ لیکن اب بڑا افسوس اور پچھتاوا ہوتا ہے کہ کیسی کیسی غلطیوں سے ملنے اور صحبت میں قحطی ملنے کا موقع ملا مگر کچھ فیض حاصل نہ کیا۔

بابا سے ہمارا تعارف تو سسرال آئے کے بعد ہی ہوا مگر بحیثیت قاضی صاحب کی لڑکی کے!! ایک کویہ سس کر تعجب ہو گا کہ صبح معنوں میں حیدر آباد آکر ہی قاضی صاحب کی بیٹی کو بھی قاضی سے متعارف ہونے کا موقع ملا اسی کو تو کہتے چراغ تلے اندھیرا۔!

حیدر آباد میں آبا کے دوستوں اور مداحوں کی کمی نہ تھی۔ خاندانی روابط نبھانے کا رولج ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد میں کوئی ایسا نہ ہوتے ہوئے بھی آبا کے چاہنے والوں کی وجہ سے احساس تنہائی کا کچھ کبھی نہیں ہوا۔ (جنہوں نے مجھے عزیزوں سے بڑھ کر چاہا اگر ان ناموں کو گانے بیٹھ جاؤں تو ڈر ہے کہ اپنے موضوع سے بہت دور نکل جاؤں گی) جب حبیب الرحمن صاحب سے ملی ہوں تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ”انجن ترقی اردو“ کے معتمد کی حیثیت سے جائزہ لے چکے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب ”یادداشتیں“ میں اس طرح کرتے ہیں۔ ”یہ سوال جوں کا توں تھا کہ کیسے وقت گزاریا جائے۔ اسی ذہنی بے چینی کے زمانے میں پنڈت سندر لال جی اور قاضی عبدالغفار صاحب انجن ترقی اردو (ہند) کی کمیٹی غلطیوں کے تعلق سے دورہ کرتے

ہوئے حیدر آباد پہنچے اور یہاں کی شاخ کو دوبارہ متحرک کرنے کی غرض سے میرے مکان پر چڑھ
اجاب کو مدعو کیا۔ اس اجتماع کے نتیجے میں انجمن ترقی اردو، شاخ حیدر آباد کا کام میرے سپرد
کیا گیا۔ اور اس طرح خود کو مصروف رکھنے کے لئے مجھے ایک کام مل گیا جو عین میری دلچسپی کے
مطابق تھا۔ ”یہ تھی وجہ تسمیہ انکے انجمن سے وابستہ ہونے کی !“

اردو حبیب الرحمن صاحب کے لئے ذریعہ معاش کبھی نہیں رہی۔ اور نہ ہی اردو اس
سے پہلے کسی توجہ کی محتاج تھی۔ کیونکہ اردو کے جانناڑوں اور پرستاروں کی کمی نہ تھی۔ وہ تو
حکمرانی کرتی تھی۔ لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بساط اُلٹ گئی۔ مہرے
تتر بتر ہو گئے اردو بے سہارا ہو گئی اس وقت حبیب الرحمن صاحب ہی تھے جنہوں نے اپنی
آغوش میں سمیٹ لیا اور اسکی بقا کا بیڑہ اٹھایا۔ انہیں کا طفیل ہے کہ جب اردو اور اردو
طبقہ ہدف ملامت بنایا جا رہا تھا اُس وقت اردو ہال کھلے نہ صرف اپنی زمین کا عطیہ دیا بلکہ اردو
ہال تعمیر کر کے لگایا ایک کارنامہ انجام دیا اور اسکے ٹرسٹ کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ اردو
کے تمام جلسے اسی ہال میں ہوا کرتے تھے۔ باہر سے آنے والی مشہور ہستیوں کا خیر مقدم بھی اسی ہال
میں ہوا کرتا تھا۔ اردو مجلس کے اجلاس تو آج بھی اردو ہال میں منعقد ہوتے ہیں۔

اگے بڑھنے سے پہلے حبیب الرحمن صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا
چاہتی ہوں جو میری نظر سے گذرے ہیں۔ ۶۶۳ تا ۶۶۴ کی بات ہے ”اردو کا لچ میگزین“ کے لئے
میں ان پر مضمون لکھنا چاہتی تھی کہ اگر انکے سان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں کچھ لکھ رہی ہوں
تو بڑی خبر لیں گے۔ مثلاً اگر انہیں کے بارے میں ان سے کچھ پوچھوں تو اُلٹا مجھ ہی سے پوچھا
جائے گا ”خیریت تو ہے مجھ پر جرح کیوں کی جا رہی ہے۔“

اور اگر ڈرتے ڈرتے مدعا زبان پر ہی آجائے تو بڑی زور سے لا حول پڑھیں گے
اور نہایت بے مروتی سے فرمائیں گے۔ ”کیا نفویت ہے ! آپ کو کوئی دوسرا کام نہیں ہے؟“
اس اچانک حملے سے اوسان خطا ہو جائینگے اور لکھنا تو کیا جو مضمون سوچا تھا وہ بھی تھوڑی
دیر کو دماغ سے نکل جائے گا۔ یہی سب سوچ کر اُن سے کچھ دیر یاقت کرنے کی ہمت ہی نہ

ہوئی۔ معجزہ رائج سے جو کچھ معلوم ہو سکا اور کچھ جو آنکھوں نے دیکھا تھا اسکی مدد سے
مضمون لکھا گیا ہے۔

حبیب الرحمن صاحب پیدائشی حیدر آبادی ہیں، مدرسہ آصفیہ۔ دارالعلوم اور
نظام کالج کے بعد علیگڑھ سے ایم اے، ایل ایل بی کامیاب کیا تعلیم سے فارغ ہونے کے
بعد کچھ دن علیگڑھ میں معاشیات کے لکچرر رہے۔ دارالعلوم اور علیگڑھ کا ذکر ٹرے
چاؤ سے کرتے ہیں۔ دکنی ہوتے ہوئے بھی علیگڑھ کا رنگ کچھ اس قدر گہرا ہے کہ حیدر آبادی
ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یورپی والے تو ان کو حیدر آبادی ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔
ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر بابا کوہیل۔ بی۔ بی۔ پڑھنے کی کیوں سوچی۔ دودھ
کا دودھ اور پانی کا پانی جس کا اصول ہونا کادکالت کرنا معلوم۔ لیکن اللہ کے بعید اللہ
ہی جانے کسی اور کی دکالت کر سکے یا نہیں اردو کی دکالت تو ڈنکے کی چوٹ کرتے رہے۔ اسی
کا نتیجہ ہے حیدر آباد میں اردو نے اپنا مقام واپس لیا۔ اور آج جس طرح پھل پھول رہی ہے
اسکی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ غرض علیگڑھ سے عثمانیہ یونیورسٹی آگئے اور معاشیات کے پروفیسر
مقرر کئے گئے۔ اسے آء میں انگلستان جا کر لندن اسکول آف اکنامکس سے B.S.C ڈگری
لی۔ مختلف ماہرین معاشیات کے علاوہ پروفیسر لاسکی کے شاگرد بھی رہے جس کا ذکر ٹرے
نحر کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں اردو میں معاشیات پر کتاب بھی لکھی۔ گو حبیب الرحمن صاحب اس
کو اذکار رفتہ کا نام دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اردو سے پڑھنے والے اس
کتاب کی مدد سے اپنی راہ میں تلاش کرتے ہیں۔

تقریباً ۱۳ سال عثمانیہ یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد محکمہ اطلاعات کے ناظم مقرر
ہوئے۔ چند سال بعد ہی محکمہ صنعت و حرفت نے انکی خدمات حاصل کر لیں۔ اسوقت نواب
مہدی نواز جنگ پوری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انکے بعد حبیب الرحمن صاحب
انکے جانشین ہوئے۔ ابھی ملازمت کے چار سال باقی تھے کہ ۱۹۴۹ء میں اپنی مرضی سے وظیفہ

پر سبکدوش ہو گئے۔

بابا جب کچھ کام کی ذمہ داری لیتے ہیں تو احساسِ ذمہ داری دو چند ہو جاتا ہے۔
 انجمن کی معتمدی کیا سمجھا لی کہ اردو کے ہو کر رہ گئے اور انحرافِ اردو کی بقا کا ایک پہلو ۱۹۵۶ء
 میں اردو کالج کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس اقدام سے نہ صرف اردو کو بڑھاوا ملا بلکہ ان لوگوں
 کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل گئے جو کسی مجبوری سے تعلیم جاری نہ رکھ سکتے تھے مگر یہ ثابت
 جاریہ کی سبیل بھی پیدا ہو گئی۔ اردو کالج کی پہلی کھیپ میں یہ ناپزیر بھی شامل تھی۔ میں نے
 یہاں سے ڈپ ادال اور بی ادال کامیاب کیا تھا۔ کیسے معصوم دن تھے وہ۔ اساتذہ کی
 لئے لوٹ خدمت کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی کہ بلا معاوضہ پندرہ رس میں بیٹے رہتے تھے۔
 انکی سچی لگن طالب علم کی لگن شوق کو بھڑکاتی رہتی تھی۔ شعروادب سے وہ منکشی شاہین مافی کی خوش
 اور ناقابلِ فراموش دور بن چکا ہیں ابھی اردو کالج کو قدم جلے قدم مل بھی نہیں ہوئے تھے کہ محترم حسینی شاہد
 صاحب نے اردو آرٹس کالج کا شوشہ چھوڑا۔ کسی شاعر نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے کہ ”جیٹھٹی
 ہتیس ہے منہ سے کھڑکی ہوئی“ اردو کا نشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور یہ نشتہ ہی تو تھا کہ
 باوجود مخالفتوں کے نہ صرف بیرون کی بلکہ بیرون کی بھی۔ ایسوں کی مخالفتوں کا مقابلہ بڑا سہولان
 رواج ہوتا ہے۔ اردو آرٹس کالج قائم ہو گیا۔

آرٹس کالج کے قیام کے سلسلے میں حسینی شاہد صاحب کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہوگی کیوں کہ وہ
 بابا کو سیکھے یا سمجھانے میں اور ان کی پریشانیوں میں برابر کے شریک رہے کالج کے قیام میں جس
 جوش و خروش کا شاہد بھائی نے اظہار کیا۔ وہ بلا معاوضہ حبیب الرحمن صاحب کے ارادوں کے لئے
 سہارا ثابت ہوئے اگر بابا میری گزارش ہے کہ وہ خشک مزاج ہیں تو یہ بہتان شاہد بھائی پر بھی
 لگا یا جا سکتا ہے بس یوں سمجھئے کڑوا کر یہ لایم چڑھا۔
 حبیب الرحمن صاحب کا وہ زمانہ آج بھی آنکھوں میں گھوما کرتا ہے جب ان کی عمر ۶۵ء

کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن ارادے - حوصلے اور عزم کے اعتبار سے نوجوانوں کو بھی مات کر دیتے تھے۔ ان کے جوش و ہمت کو دیکھ کر نوجوانوں میں کام کی انگ پید ا ہوتی تھی۔ بابا نچے تو بیٹھ ہی نہ سکتے وقت کا ایک ایک لمحہ بامقصد اور کارآمد طریقے سے گزارتے۔ یعنی محض انجمن اہل اردو کالج صرف سیرے کے لئے کافی نہ تھے بلکہ دوست احباب کے اصرار پر کئی اداروں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ علا الدین ٹیکنیکل کالج اور ممتاز کالج کے تودہ بانی ہی تھے اہمیفہ بانی اسکول جیب کہ دم توڑ پڑھا تھا بابا اس کے لئے مسیحا ثابت ہوئے ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ غیر اردو دہل حضرات کے لئے اردو کی کلاسیں چلائیں اور خود معلم کے فرائض انجام دیئے۔ امتحان لیکر ڈیلو ما بھی دیتے تھے۔

حسب امر حائل صاحب جو گھر میں ہیں وہی باہر و قافل میں بھید بھاؤ کی گنجائش ہی نہیں۔ بے حد اصولی انسان ہیں۔ بعض خویاں اور عادتیں ایسی ہیں کہ عام طور پر مشکل ہی سے نظر آئے گی اور شاید انھیں خویوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی پرکشش ہو گئی ہے۔ وہ بہت صاف ستھرے اور سادہ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔ تصنع اور نمائش سے شاید ہی کوئی اتنا گھبراتا ہو جتنا یہ بریشان ہو جاتے ہیں کبھی کبھی فائدہ بخش قسم کا نمائش بھی ان کے لئے اکٹا ہٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ جیسے ایک مرتبہ اردو کالج کی طرف سے یوم شعلی "منانٹے پایا" استادوں اور طلباء کی خواہش تھی کہ یوم شاندار یہمانے بسر منایا جائے مگر چنانچہ دوسری تیاریوں کے علاوہ اردو ہال کی سجاوٹ پر بھی خاصی توجہ دی گئی۔ ان علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کالج کی کچھ شہرت ہو۔ فرض ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر ہم لوگ کام میں جئے ہوئے تھے دو دن تک بابا بیڑے ہبر کے ساتھ اردو ہال کے بناد سنگھار پر بقول انھیں کے ہماری توانائیاں برباد ہوتے دیکھتے رہے آخر صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ ہال پر بڑی تنقیدی نظر دوڑائی اور بولے "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ یوم شعلی مناسبتے ہیں یا شعلی صاحب کا عرس"۔ ۱۹ اردو کالج کی امداد کے لئے جب بھی کسی تفریحی پروگرام کی تجویز پران کے سامنے رکھتی گئی "ابنی توبہ کہہ رہے" کہہ دیتا کہ نہ ہو۔

بیا دور سے دیکھنے والوں میں خشک مزاج مشہور ہیں۔ کچھ دیر ان کی صحبت میں گزاریے تو معلوم ہوگا کہ خوش مزاجی کا ایک آبشار رواں ہے۔ گفتگوں اٹھنے کو جی نہ چاہے صبرِ رحمن صاحبِ شفیق پر خلوص اور محبت بھرے دل کے مالک ہیں لیکن ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دیکھتے ہی آپ کو بانہوں میں لٹائیں گے یا کیچے سے لگائیں گے یہ سودا ہے ان کے خلوص و محبت کا آئینہ دار انکار دینا اور سلوک ہوتا ہے۔

حبیب الرحمن صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں میں بھی ان کا خیال رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں میں اردو کالج میں تھی تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی اس وقت ان کے کام کئے کا طریقہ اور رہن سہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مثلاً ان کے بلنگ کے پانستی ہمیشہ اخباروں اور فائلوں کا ڈھیر نظر آئے گا لیکن غور کریں تو اس میں بھی ایک ترتیب اور سلیقہ! ہر اداسے کے فائل کی جگہ مقرر کیا محال کہ فائل کی جگہ بدل جائے یا اخبار کی ترتیب میں تاثر کچھ کا فرق اچالے۔

آپ خواہ کتنی ہی بابتی سے انجن کا چنہ دیتے ہوں آپ کی بابتی وقت کے موصوف قابل بھی ہیں اور آپ کی ایماندارمی پر کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ انھوں نے یہ اصول بنالیا ہے کہ چنہ وصول ہونے تک یاد دہانی کرتے رہیں اس لئے آپ کے پاس اس وقت تک یوسٹ کارڈ آتا ہے کہ جب تک چنہ ان کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے اور پھر اس ہاتھ سے چنہ لیبل کے دوسرے ہاتھ سے رسید تھما دیں گے۔ یہی معاملہ حساب کتاب کا ہے۔ انجن کا چنہ ہی انہیں بلکہ دوسرے تمام اداروں کا حساب کتاب گھر کے اخراجات و آمدنی کا حساب ایسا درست رکھتے ہیں کہ اگر آدنی رات کو بھی انکم ٹیکس والا دروازہ کھٹکھٹائے تو حساب کھینچ کر گھر میں یا بی بی بیجائے اور اپنا سامان لے کر لوٹے۔

وقت کی بابتی سب سے اہم اصول ہے۔ انجن کے جلسے ہوں یا گھر کی کوئی محفل ایک سنہ تاخیر بھی

برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھتے تھے انہیں اور اردو جلس کے موقعوں پر اگر مقرر وقت کا لحاظ رکھتے تو بارہ کی طرح بے چین ہو جاتے کہ سی پیر مسلسل بہلو بدلتے رہتے کبھی بولتے دے پیر کبھی ہاتھ کی گھڑی پر نظریں جانتے۔ شیروانی کے دامن کی ٹوگو یا شامت آجاتی ہر منٹ بے چینی میں دامن بدلتے کبھی دایاں بائیں پیر اور کبھی بائیں دایاں پیر اور پھر یہ ایسی بیزاری اور بے چینی اور بے بسی کہ ہر شخص محسوس کر لے۔

وضع داری کا یہ عالم ہے کہ دوست نہ بھی ہے تو اس کے خاندان سے روابط قائم رکھتے۔ مجھے یاد ہے میں ڈیپ۔ او۔ ال کا امتحان دے رہی تھی اردو بال اگر امتحان کے لئے یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ بابا نے ایک طریقہ بنا لیا کہ میرے آتے ہی سلام دعا کے بعد کہتے ”اد جلدی۔ چلے پی لو بالکل تیار رہے“ ابا کا انتقال ہو چکا تھا ظاہر ہے مجھے شکایت کا موقع تھا نہ ہی ابا اگر گلہ کرتے کہ میری بیٹی سے چائے تک کونہ یو چھا۔ ابیر بابا کی وضع داری تھی ایسا کرنے کو اتنا دل چاہتا تھا۔ خالہ جان (بیگم حبیب الرحمن) کے ہاتھ سے بنے دیہی پر ہمیشہ میری نیت خواب ہو جاتی تھی دن کے کسی حصے میں بیہوش جاؤں بیگم یا شتا کو یاد لاتے بھی اس کو دیہی تو کھلا دیجئے۔

بیگم یا شتا ان کی رفیقہ حیات تھیں زندگی کا طویل سفر ایک سچے رفیق کی طرح طے کیا سوچتی ہوں کہ ان کے بنا بابا کو کیسا لگتا ہوگا۔ بیوی کی چھوٹی کا دکھ ابھی تازہ ہی تھا کہ بیٹے کی موت کی خبر سننا پڑی۔ تقریباً چار سال سے کراچی میں بیٹے کے ساتھ ہیں۔ حبیب الرحمن صاحب حیدر آباد سے باہر جانے کے تصور سے بھی گھبرا جاتے تھے اور اب ایسا وقت آیا کہ حالات نے وطن ہی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کتنا محبور ہے انسان۔!

تأثرات سفر

اشفاق کا پہلا سفر تو تھا حضرت آدم کا موعی بنی حواء کے ازجنت الفردوس تا کرۃ ارض اور آخری سفر جس کو سفر آخرت کا نام دیا جاتا ہے تقدیر میں کھو دیا گیا ہے لیکن کب کہاں اور کس وقت یہ سفر دریش آجائے اس کی اللہ میال نے بھٹک تک نہ دی البتہ پہلے اور آخری سفر کے درمیانی وقفہ میں یوری آزادی سے دی گئے میرے بندو گھومو پھرو کھاؤ پیو، دلکشت مناظر کا لطف اٹھاؤ اور قدرت کا تماشا دیکھو اگر عقل رکھتے ہو تو جستجو بھی کرو اور عبرت بھی حاصل کرو۔

تو جناب علی ہم نے اللہ کے فرمان کو سراٹھکوں یر لیا اور یہ کہتے ہوئے نکل پڑے سفر پر کہ

”سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں ۹“

اپنے ملک کی تو خوب سیر کی تھی لیکن ملک سے باہر نہلا سفر کینڈا کا تھا کہ وہاں ہمارا قواسم پیدا ہونے والا تھا۔ جی ہاں آج کل تائی یو سے دیار غیر میں پیدا ہوتے ہیں۔ بچے بیٹیاں ماں باپ کے یاس کے آنے کے ماں باپ انکے یاس جاتے ہیں اسی کو کہتے ہیں رام تیری الٹی گتگا!

یہ سفر اس لئے بھی اہم رہا اتنا لمبا سفر ہم تنہا طے کر رہے تھے اور فائدہ ان والے دانٹوں میں انگلی کہ دہلے ہماری ہمت یر غش غش کر رہے تھے۔ غرض سب کو انگشت بندلاں چھوڑا ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کی درمیانی سب بجئی سے بذریعہ ایرنڈیا اٹے تو لندن جا کر دم لیا۔ یہاں چند گھنٹے ہوائی جہاز پر چھرا کیونکو اندر صفائی اور بیابریٹوں کی بھرائی کا کام ہوتا تھا کافی مسافر بیٹھ سیدھی کرنے اور پیروں کو قابل استعمال رکھنے کے لئے اترے۔ ظاہر ہے خمیداری کی نیت بھی باندھی ہوگی۔ ہم نے دور اندیشی سے کام لیا اور اپنی جگہ ڈے ڈے ہمیں اپنے اغواء کا خدشہ تو ہمیں تھا کیوں کہ تائی نے جاسے ہے تھے البتہ اپنی گمشدگی کا اندیشہ ضرور لگا تھا ابھی تک حیدر آباد کی سڑکوں سے یوری طرح مانوس نہیں ہوئے تو لندن کے ایرپورٹ پر جس کے متعلق سن رکھا تھا کہ جہاز میں سوار ہونے کے کئی راستے ہیں اور ایک

وقت میں کمی ہوئی جہاز تیار کھڑے لیستے ہیں ایسی صورت میں ہمارے لاپتہ ہونے کے کافی روشن امکانات تھے جھلا بکائیے ہم نے سمجھداری سے کام لیا کہ نہیں؟ یوں جہاز کے اندر کی مٹی دھجسیاں کچھ کم نہ تھیں جہاز کی فضا کی کرینوالی ٹرکیاں - ہمارے! کیا سیاری بھوئی بھالی صورتیں اور اس پر قسمت کی ستم طرینی یہ کہ ہاتھ میں جھاڑو - کچھ کچھ شبہ ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کون جانے کالاصاب لوگ ابھیں کو بکڑے جاتے ہوں کیوں کہ ہم نے اپنے آبا سے سنا تھا کہ اٹھارہ سال یا شاید اکیس سال کی عمر ہونے تک ولایت کے اچھے خاندانوں کی ٹرکیاں کسی محفل میں شریک نہیں ہوتیں اور بغیر نگران کے گھر سے یا ہر نہیں نکلتی تو جھلا ہمارے صاحب لوگ کی وہاں تک پہنچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جسے کربات جھاڑو والی تک ہی پہنچتی ہوگی۔

جھاڑو والیوں کی صورتوں کو آنکھوں میں بسائے لندن سے روانہ ہوئے تو نیویارک پہنچے یہاں جہاز تبدیل ہوا تھا۔ ایرکینڈل کے جہاز میں بیٹھ کر جانب کینڈا ایرواز کر گئے چند گھنٹوں میں ٹورنٹو پہنچے ایک رات وہاں گزار کر ویننگ *VINNIPES* کے ایرپورٹ پر جائزے جہاں اپنے بیٹے کو منتظر پایا۔ کچھ سے لگایا بلائیں تیس اور کار کے ذریعے دو گھنٹے میں منزل مقصود برندن *BRANDAN* پہنچ گئے۔ لندن سے یہاں تک کیا گزری اس پر پردہ بڑا ہے تو ہی بہتر ہے ورنہ ہمارے تاثرات سننے سے پہلے ایسا نہ ہو کہ ہماری حماقتوں کی روداد سن کر ہماری طرف سے آپ کے تاثرات متاثر ہو جائیں قصہ مختصر! کہ اس طرح ہم نے لگے ہاتھوں کینڈا کے تین سفر کر ڈالے۔

کینڈا دینا کے بڑے ملکوں میں دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے آبادی رقبہ کے اعتبار سے بہت کم ہے یعنی دو کروڑ تیس لاکھ! خوشحال کھاتا ایسا ملک ہے۔ معدنیات کے خزانوں سے قدرت نے دل کھول کر نوازا ہے کمی موسم ہوتے ہیں ہر موسم اپنا ایک الگ کردار اور منفرد حسن رکھتا ہے۔ قدرتی مناظر کی ہیئت ہے۔ نیا گرا آبشار کی کشش تمام دنیا کے سیاحوں کو اپنے اطراف جمع رکھتی ہے لیکن جہاں تک تہذیب و تمدن کا تعلق ہے وہ یہاں پایید ہے اس ملک کو عالم وجود میں آئے شاید ایک صدی بھی نہیں گزری اس لئے یہاں آثار قدیمہ قسم کی کوئی چیز ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس قدر کیسائینٹ

ہے کہ ایک بار ملک گھوم لینے کے بعد دوبارہ جانی خواہش نہیں ہوتی مثلاً ایک مکان اور ایک دکان اگر آپ نے دیکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ جہاں بھی آپ جائیں گی یہی نمونے نظر آئیں گے حتیٰ کہ گھروں کی سجاوٹ اور دکانوں میں رکھا سامان تک یہی یکسانیت وہاں کے لوگوں میں بھی ہے، وضع قطع طور طریقہ سب ہی ایک جیسے ہیں۔

یوں تو اچھائی برائی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن کچھ برائیاں جو وہاں ہز کی طرح برتی جاتی ہیں جب اپنے ہندوستانیوں کو اس میں ملوث دیکھتی ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے میں وہاں کے بن سہن سے بہت متاثر ہوں۔ کئی چیز تاک اور بر تاک انکسافات ہوئے اور چونکا دینے والے واقعات بھی پیش آئے۔ کچھ باتیں دل میں گھر کر گئیں تو کچھ نے بد دلی اور بیزاری کا احساس دلایا۔ اصل میں بنیامک ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی تمدن یا اعلیٰ قدریں ان کے حصہ میں آئی ہیں اور اگر ان کے ساتھ اعلیٰ روایات آئی بھی ہوں گی تو مشینی زندگی میں الجھ کر وہ اس کی حفاظت نہ کر سکے سچے پوچھئے تو وہاں کی دنیا ہی نرمی ہے بیماری دنیا سے بالکل مختلف ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی خوبیوں کا ملک ہے سچا صاف سچرا۔ لوگ ہنس نکھ وقت پر کام آتے۔ تجارت ہو یا سرکاری ملازمت ایسا ندری اور دیاننداری سے انجام دیتے ہیں۔ وقت کے پابند و عدسے کے پکے اور زبان کے سچے قابل بھر دسم ہوتے ہیں اور آپسے بھی توقع رکھتے ہیں کہ ان کے اعتماد کو بھٹس برہو بچائیں گے۔ ناپ تول زیادہ ہو سکتا ہے بلکہ اگر نہیں نے ایک گز بیڑا لیا تو ہرا گز نکلا کسی دکان سے خریدی ہوئی چیز اگر آپ ایک جینے کے بعد بھی واپس کرنا چاہیں تو دکاندار خوش دلی کیساتھ لے کر قیمت واپس کر دیتے ہیں ایسا بھی میرے ساتھ کئی بار ہوا۔

عام زندگی میں کام کی تدریج جاتی ہے کام کرنے سے غرض کام کی نوعیت کیا ہے اسکی پیرا وہ نہیں کرتے جیسے جیسے کام کرنے میں کوئی بھی شرم محسوس نہیں کرتے اسی لئے آپس کے تعلقات میں ہمدرد یا ستھو ایش حاصل نہیں ہوتی۔ ہوٹل میں بھڑو دینے والا مالک کیسا ننڈہ بے تکلفی سے بیٹھ کر کافی پیتا ہے اور

نے بھی عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دیا ہے بلکہ کہیں کہیں عورت کے حقوق مرد سے زیادہ ہی ہیں گھر کے کاموں میں بھی مرد کو بیوی کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے جب ان کے یہاں یہ ہلچل آئی تو لاہوتک ہے تو ماں کے ساتھ ساتھ ہونے والے باپ کو بھی بچے کی پرورش کے پوسے گھر سکھائے جاتے ہیں ہم نے اکثر بازاروں میں دیکھا کہ بچے کو سنبھالنے کا سلیقہ باپ میں زیادہ ہے۔

کنیڈین بڑے زندہ دل اور شوقین مزاح ہوتے ہیں۔ غرض یہ لوگ بھرپور زندگی گزارنا خوب جانتے ہیں باوجود ان تمام خیروں کے اور جبکہ معاشی طور پر مطمئن ہونیکے ازدواجی زندگی میں بڑا بھول نظر آتا ہے ہر روز گھر اُجڑتے ہیں اور بچے بیمار ہوتے ہیں جھگڑے اور لڑائیاں جو با تھاپائی تک پہنچ جاتی ہیں روز کا معمول ہیں۔ اخبارات ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں بن بیاہی ماؤں کی بھی کمی نہیں ان لڑکیوں کی عمریں مشکل سے ۱۴ یا ۱۵ سال ہوتی، سوں گی ایسی مائیں اکثر بچے کو ہسپتال میں ہی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں کبھی تو بچے چلے یتم خاتون میں پتے ہیں اگر قسمت اچھی ہو تو کوئی لاولد گود لے لیتا ہے۔

میرا خیال ہے اعلیٰ اقدار اور مذہبی روایات جو بزرگوں سے وراثے میں ملتی ہیں اور زندگی کی لاپس متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں ان کو یہاں فقہان ہے عمر یا نیت اور بے حیائی انکی ہتذیب ہے جس طرح جذبات کی رو میں بہہ کر چھوٹی چھوٹی ٹھنڈوں میں شادیاں کرتے ہیں اسی طرح چند برسوں میں اپنے ہاتھوں ختم بھی کر دیتے ہیں۔ نجی معاملات میں یہ لوگ کسی کا دخل پسند نہیں کرتے بزرگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا یا اہم قدم اٹھانے سے پہلے ان سے مشورہ کرنا کسر شان سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہیکہ ایسی عقل کے بل بوتے پر اُلٹے سیدھے فیصلہ کر لیتے ہیں یہ ترقی یافتہ ملک تو فرد ہے لیکن نہ جانے انکو CIVILISED COUNTRY یعنی ہتذیب یافتہ ملک کیوں کہا جاتا ہے ان کے ذہنوں میں ہتذیب کا جو بھی تصور ہو کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے دیکھئے وقت کس طرح بے لگا کر اُڑ گیا اور ابھی تو بہت کچھ کہنے کو باقی رہ گیا خاص کر بچوں اور ہندوستانی خاندانوں کا طرز زندگی وغیرہ۔ خیر پھر سہی۔

شہر حیدر آباد کی تعلیمی ترقی میں خواتین کا حصہ

خواتین میں تعلیمی ترقی اور بیداری کا ابتدائی کام مردوں ہی کو کرنا پڑا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک ہمارے سماج کے ایسے بندھے ٹکے اصول تھے کہ عورت کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ اپنی تعلیمی بیداری کے لئے کوئی عملی قدم اٹھائیگی ناممکن سی بات تھی۔ جنگ آزادی اور غدر کی افرا تفری کے بعد سماج کی چولیں ہل گئیں اور مختلف طبقوں میں ایک ایسا انتشار پیدا ہوا کہ اُس نے سنجیدہ ذہنوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مصلحین اور مفکرین نے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ عورت کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ اگر ہم ہندوستان کے اُس دور کی تمام زبانوں کا ادب پڑھیں تو اکثر و بیشتر زبانوں میں چند موضوعات مشترک نظر آئیں گے جن میں عورت کی تعلیم اور سماجی حیثیت کا موضوع نمایاں نظر آتا ہے جو درمیںوں جانیئے۔ سر سید، نذیر احمد، حالی اور شبلی کے ساتھ ساتھ اگر تلگو کے ”ویریش لنگم“، کو بھی پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ اُس زمانے کے حساس دل اور بیدار دماغ ایک ہی جیسے خطوط پر سوچ اور لکھ رہے تھے۔

ایسی بات نہیں تھی کہ جنگ آزادی سے پہلے تعلیم نسواں کا رواج ہی نہ رہا ہو یا نہ یہ ایک خاص طبقے تک محدود تھی، امراء اور خوشحال گھرانے اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے تھے۔ ان خواتین نے ادب کی دنیا میں نام بھی پایا اور نہ باہر کی بیٹی گلبدن بیگم اور شہزادی زیب النساء تاریخ ادب میں جگہ نہ پاتیں جنکے ادبی مشہ پارے آج بھی توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس مقام تک پہنچنا صرف شاہزادیوں اور رؤساء تک ہی محدود تھا۔ نچلے متوسط طبقے کا ذکر ہی کیا۔ خود متوسط طبقے کے شرفاء میں بھی لڑکیوں کو تحریری

بزرگ پڑھنا تو سکھا دیتے تھے لیکن عورت کے ہاتھ میں قلم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب سرسید کے عہد میں ایک عام بیداری کی لہر آئی اور اصلاح حال کا شعور پورے جاگزا تو لڑکیوں کے مستقبل کی اہمیت کھل کر سامنے آئی اور کچھ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی کتابوں ”مرآة العروس“ اور ”بنات النعش“ میں لڑکیوں کیلئے ایک ایسے مکتب کا نمونہ پیش کیا ہے جس میں جہاں امینہ زادی، حسن آرا اور شریف زادی، محمودہ یکجا ہیں تو وہیں کنجڑوں اور قلعی گروں کی لڑکیاں بھی پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں گو یا نذیر احمد نے ایک جمہوری نظام تعلیم پیش کر کے ہر طبقہ اور حیثیت کی لڑکوں کی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مولانا حالی نے اپنی نظموں میں عورت کی حالت زار پر روشنی ڈالی ہے اور ”مجالس النساء“ میں انکی تعلیم کا مطالبہ کیا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس کتاب کا مقصد ہی تعلیم نسواں ہے۔ ذرا تو غور تو کیجئے ایک ایسے ماحول میں جبکہ عورت اپنے وجود کو بھی شک کی نظر سے دیکھتی تھی ایک روشن خیال عالم دین عورت کے حق کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے حالانکہ مولانا شبلی تھے تو مذہب اور تاریخ کے عالم لیکن انہوں نے نئی اور باقاعدہ تعلیم کو ناگزیر بتایا ہے یہاں تک کہ مردوں اور عورتوں کے لئے ایک ہی نصاب تعلیم کی سفارش کی ہے تاکہ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

ان مصلحین کی کوششیں رنگ لا کر رہیں۔ رفتہ رفتہ جگہ جگہ چراغ سے چراغ جل اٹھے۔ بڑے شہروں میں تعلیم نسواں کے چرچے ہوئے تو چھوٹے شہروں، ضلعوں اور قصبوں تک کرینیں پہنچیں۔ ایسے میں ہمارے نسوانی رسائل اور روشن دماغ ادیبوں نے تعلیم نسواں کو عام کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان رسائل میں تہذیب نسواں، عصمت اور بنات سرپرست نظر آتے ہیں۔ یوں تو ان پریچوں کی فہرست طویل ہوتی گئی۔ اگرچہ کہ اکثر یہیچے تہذیب اور عصمت کی طرح اشاعت کی پابندی نہ کر سکے۔ جیسے ”نساء جو لجدیں“ ”زیب النساء“ کے نام

سے شائع ہوتا تھا جس کی ادالت میں محترمہ صفراہیالوں صاحبہ نام آتا ہے۔ اسکے علاوہ خاتون مشرق، حور، سہیلی، اور ”شعاع اردو“ وغیرہ ان رسائل نے یاد بخود اپنی مختصر عمر کے خواتین کے شعور کو بیدار کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اسکے لئے ہم کو انکا ممنون ہونا چاہیے۔

حیدرآباد بھی دہلی ریاست رہی ہے یہاں بھی شمالی ہند کی طرح ایک عرصے تک غدر سے پہلے والی کیفیت موجود تھی اور تعلیم صرف شہزادیوں اور صاحبزادیوں کی مہارت سمجھی جاتی رہی ہے۔ متوسط طبقے میں تعلیم نسوان کے نام پر تھوڑی بہت دینی تعلیم کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ جہاں تنگ مردوں کی بالادستی نے عورت کو جہالت کی تاریکیوں میں پھنکے پر محبوس کیا وہیں ایسی حساس دل اور روشن خیال ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے عورت کے حق کیلئے آواز اٹھائی اور علم کی برکتوں سے فیضیاب ہونے کی راہیں سمجھائیں۔ ان ہستیوں میں ایک مولوی محمد حسین صاحب بھی تھے۔ حیدرآباد میں محمد حسین صاحب وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے عورت کے مسائل اور علم سے اسکی محرومی کو شدت سے محسوس کیا اور تقریر و تحریر کے ذریعہ لوگوں کو متوجہ کیا۔ انہوں نے حقوق کی وکالت ہی نہیں کی بلکہ ایک ماہنامہ ”معلم النساء“ کے ذریعہ آزادی نسوان کا پرچار بھی کیا۔ یہ قوسب جاننے ہیں کہ شخصی حکومتوں میں آزادی کی باتوں کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اور وہ بھی عورت کی آزادی کی بات !!

مولوی صاحب کو اپنی آزاد خیالی کیلئے قدم قدم پر مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا اور آخر کار حکم سرکار ”معلم نسوان“ کی اشاعت روک دی گئی لیکن وہ اپنے مقصد کو لیکر آگے بڑھتے رہے۔ بہت سوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی آواز پر لیبیک کہنے والوں میں نواب ممتاز یار الدولہ اور نور شید علی صاحب کے نام ملتے ہیں۔ ان اصحاب نے محمد حسین صاحب کے مشن کو چلانے میں ہر طرح انکی مدد کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ چنانچہ سلطنتِ آصفیہ کے سرکاری نسوانی

مدارس سے قبل ہی باہمت خواتین نے سماجی اصلاحی کام کے ساتھ ساتھ تعلیم نسوان کو عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اگر ہم صرف تعلیمی میدان تک ہی محدود رہیں تو ہمیں کئی نام مل جائینگے جیسے خاندان سالار جنگ کی صاحبزادی نور النساء بیگم، بیگم خدیوہ جنگ اور انکی دونوں صاحبزادیاں معصومہ بیگم اور مرحومہ سیکمنہ، صغرا ہمالیوں مرزا، بیگم امیر حسن لیڈری حیدری، رفیقہ بیگم احمد حسین مدنی، انکی دختران سارا بیگم مرحومہ اور رابعہ بیگم وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کچھ اپنے اپنے حلقوں میں خاموشی کے ساتھ علم کی دولت لٹاتی رہیں۔ اور کچھ کے کارناموں سے لوگ واقف ہوئے جنگی یادگار ہیں آج بھی ناعاعد حالات کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ کام میں جُٹی ہوئی ہیں جیسے مدرسہ منہاج الشرقیہ، معظم جاہی مارکٹ ہائی اسکول، مدرسہ صفدریہ تربیت گاہ اور سعید المدارس وغیرہ۔

تعلیم و تربیت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل میں گہرے تانے بانے کا کام کرتے ہیں۔ دونوں سے ایک بھی ناقص رہ جائے تو پھول پیدا ہو جاتا ہے اور خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا اس لئے ہماری ان بزرگ خواتین نے بھی علم کی روشنی بکھر گھڑائی کے لئے سماجی کمزوریوں کے تدارک اور اصلاح معاشرے کو اولیت دی تھی۔ اس طرح اس کام کئے کئی انجمنیں وجود میں آئیں۔ اور انھیں کے تحت چند تعلیمی ادارے آج بھی کام کر رہے ہیں۔ جن میں انجمن خواتین اسلام جسکی بانی بیگم طیبہ خدیوہ جنگ تھیں اور صغرا ہمالیوں مرزا معتمدی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اس انجمن کے تحت بھی ایک مدرسہ اس وقت بھی چل رہا ہے۔ محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ باوجود ضعیف العمری کے اسکی بقا کے لئے جدوجہد میں لگی رہتی ہیں۔

بیگم طیبہ خدیوہ جنگ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی صاحبزادی تھیں۔ سید حسین بلگرامی علمی خدمات اور تدریس و فراغت کئے آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ یہ طیبہ بیگم کو درشت میں ملے تھے۔ انکی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مدرسہ سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ یہ حیدر آباد کی پہلی

مسلم خاتون تھیں جنکو یہ اعزاز ملا۔ عربی فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ جہاں بہت اچھی انشاء پرداز مقرر، افسانہ نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے جانی پہچانی گئیں وہیں سماجی خدمات میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ انجمن خواتین دکن بیگم خضر ہالیوں مرزا صاحب کی بنا کردہ ہے جسکے طفیل میں آج ہم سب جمع ہیں۔ اسکے علاوہ انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسوان تھی جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت بڑے پیمانے پر کام ہوتا تھا۔ وینس کانفرنس کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ اس انجمن کی نگرانی میں تین مدارس اور ایک دارالافتاء قائم کیا گیا تھا۔

• صدر مجلس خواتین دکن کی جانب سے معظم جاہی مارکٹ ہائی اسکول اور تربیت گاہ زورخورد سے کام کر رہے ہیں۔

ان انجمنوں کی بانی اور اراکین اپنے زمانے کی نوجوان تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین تھیں، خوش نصیبی سے انکے گھر کے مرد اعلیٰ قدروں کے حامل دور اندیش اور دور میں افراد تھے جن کا بھرپور تعاون ان مستورات کو حاصل تھا۔ ان خواتین کا آپسی اتحاد ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ انجمنیں تو بے شک اپنے اپنے نام سے جاتی جاتی تھیں لیکن اراکین کسی نہ کسی حیثیت میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنے مضمون کھلے مواد تلاش کرنے کی کوشش کی تو یقین جانیے ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن نظر آیا۔ تعلیمی ترقی میں خواتین کے نام اور کام اتنے زیادہ ہیں کہ مختصر سے مضمون میں انکا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ بڑا دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ آج کے نوجوانوں میں ایثار کا جذبہ مفقود ہے، مل کر کام کرنے کا تصور باقی نہیں رہا اب تو جیسے دیکھئے اپنی دیرھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد تعلیم نسواں کا کام قدر آسان ہو گیا اور اعلیٰ تعلیم اور ڈگری یافتہ خواتین کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ آج تک کی تعلیم یافتہ خواتین کا تذکرہ طوالت کا باعث ہو گا اس لئے صرف ریاست حیدرآباد کے دور کی چند بیگمات کے نام پر اکتفا کرتی

جنہوں نے درس دتہ رہیں کے پیشے کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھا۔ ان میں ڈاکٹر آمنہ یوپی، بیگم رقیہ زین یار جنگ، نوشاہیہ خاتون، مس میری تندی، محمدی بیگم، لیلانی ٹائیڈو، نور النساء بیگم، مسز اکرم میر النساء بیگم، فخر النساء بیگم، ہکی قاری دانی کا سکھ چلتا تھا، سلامت النساء بیگم، تصدق فاطمہ اور جہاں بانو نقوی آج کی کئی صاحب قلم خواتین جہاں بانو نقوی کی شاگردوں میں شامل تھیں۔ مجھے خوشی ہے کہ محترمہ صفرا ہمایوں مرزا صاحبہ کی صد سالہ تعاریب کے موقع پر کچھ کہنے کا موقع ملا۔ قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو اپنے محسنوں کو یاد رکھتے ہیں اور انکے کارہائے نمایاں کو آج کی دنیا سے روشناس کراتے کی کوشش کرتے ہیں۔

جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب مرحوم کے ہم احسان مند ہیں کہ انہوں نے ریاست کی ان تمام خواتین کے تعلیمی، سماجی اور اصلاحی کارناموں کو بڑی جانفشانی اور تحقیق کیساتھ کتابوں میں محفوظ کر دیا اور بے شمار مضامین لکھ کر مختلف رسائل کے ذریعہ خواتین کو متعارف کرایا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مضامین بھی کتابی شکل میں یکجا کر دیئے جائیں۔

محترمہ صفرا ہمایوں مرزا کا نام حیدرآباد کی ان خواتین میں سرفہرست ملتا ہے جنہوں نے تعلیمی ترقی میں جی جان سے حصہ لیا۔ تعلیمی میدان ہو یا اصلاح معاشرے کا منصوبہ بنانا صفرا بیگم کا نام گرامی ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے علم و ادب کی یکساں خدمت کی ہے۔ مدرسہ صفدہ بیہ تعلیمی کارناموں میں انکی زندہ یادگار ہے۔ اس مایہ ناز خاتون کی صد سالہ تقریب کے موقع پر نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ انکے طریقہ کار کو نئی نسل تک پہنچانا ہے۔

حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر طبخاں صفدر علی مرزا کے گھر ۱۸۸۲ء میں صفراء بیگم نے جنم لیا۔ تعلیم دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ پلٹنے کے ایک نامورہ خاندان کے ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہمایوں مرزا سے ۱۹۰۱ء میں شادی ہوئی۔ شوق کتب بینی نے علمی قابلیت کو جلا بخشی۔ خداداد صلاحیتوں میں نکھارا اور اظہار کا سلیقہ آیا۔ انکی بے شمار نثری اور شعری تخلیقات

بطور نگراہ موجود ہیں۔ اسکے علاوہ رسالہ ”النساء“ جاری کر کے صحافت کی دنیا میں جگہ بنائی۔

محترمہ صفرا ہمایوں مرزا مرحومہ کے اصلاحی کاموں کی ابتداء ۱۹۰۲ء سے ہوتی ہے جبکہ لیڈی واکر نے زمانہ سوشل ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تھی۔ صفرا بیگم کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ مدرسہ صفت و حرفت آپکارب سے نمایاں کارنامہ ہے۔ اسکی عمارت کی تعمیر کیلئے ایک معقول سرمایہ وقف کر کے فراخ دلی کی مثال قائم کی۔ انکے کاموں کے اصل روح روان جسٹس ہمایوں مرزا ہی تھے جنہوں نے بیوی کا ہر طرح ہاتھ بٹایا۔ شوہر کی رفاقت میں اصلاحی اور سماجی کاموں کا آغاز کیا۔ لڑکیوں کے لئے صفرا بیہ ہائی اسکول کے علاوہ بیت المعزۃ انیس القرباء کی سرپرستی فرمائی اور انجمن خواتین دکن کا قیام عمل میں آیا۔

ایک ایسے دور میں جبکہ روایت پرستی اور قدامت پرستی شدت کے ساتھ جاری و ساری تھی۔ رسمی پردے کے خلاف آواز اٹھانا بلاشبہ صفرا بیگم کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ شدید مخالفتوں کا مقابلہ جس بے جھگری سے انہوں نے کیا اور خواتین میں ذہنی انقلاب پیدا کیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ صفرا ہمایوں مرزا وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے مردوں کے جلسوں میں خطابت سے بلجیل پیدا کی۔ اور یہ واضح کر دیا کہ عورت علم و دانش میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ۴۰ سال کی عمر میں ۱۹۵۸ء میں اس دائرہ قافی سے رخصت ہو گئیں۔ لیکن ان کا نام انکے کاموں سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کا جو نعرہ اور مطالبہ اسوقت کی دوراندیش خواتین نے دیا تھا آج اسکے اثرات صاف نظر آ رہے ہیں لیکن اگر خواتین کی تعلیم کا تناسب دیکھا جائے تو اب بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے، آخر ایسا کیوں؟

کیا ہی اچھا ہو کہ ایسی خواتین متواتر جسم لیتی رہیں تاکہ عورتوں کی علم و آگہی

کا دھارا مسلسل بہتا رہے اور انسانیت کی کھیتی سیراب ہوتی رہے۔ * *

رکشا والے

وہ ایک گھنٹہ قبل ہی دروازے پر آن موجود ہوا۔ آج اس کا پہلا دن تھا۔ یوں تو ہمیشہ میں اسکول پیدل ہی جاتی تھی مگر کالج میں قدم رکھتے ہی ہمارے والدین کو ہمارے بٹے ہونے کا احساس ہونے لگا اور انہوں نے مناسب سمجھا کہ میں کالج کو سواری پر چلا کر دوں چنانچہ آج ہم رکشا پر جانے والے تھے۔ میں نے اب تک اپنے رکشا والے کو نہ دیکھا تھا کیوں کہ غالباً جب اس سے تنخواہ کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی تو میں موجودہ تھی۔

میں کتابیں بغل میں دباؤے تیزی سے باہر نکلی اور ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ رکشا والے کا ایک ہاتھ نہ تھا۔ وہ شاید میری پریشانی کو تاڑ گیا۔ میرے ہاتھ سے کتابیں لیتے ہوئے کہنے لگا ”بیٹا آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا ایک ہاتھ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ چار چار سٹواریاں لے کر چلتا ہوں۔ اور خدائے فضل سے کبھی دھوکہ نہ کھایا“ رکشا والے کی یہ طراری کچھ مجھے پسند نہ آئی۔ مگر اس کی صاف زبان کی دل میں قابلِ فروہ ہو گئی اس دن سے برا برا اس کی رکشا میں جانی رہی۔ اس کی صورت میں ایک مطلوبیت کی جھلک۔ ٹھٹھک کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ میرا دل خود یہ خود چاہتا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ کون ہے لیکن کچھ کہتے نہ بنتا۔

آج کئی روز کی غیر حافی کے بعد مرشدہ کالج آئی۔ وہ میری ٹخن کی سا تھی ہے۔ ہم دونوں مل کر بہت خوش ہوئے ہم دونوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جو بھی پہلے جاتا اس کو سواری تک آکر رخصت کرتے۔ آج بھی وہ حسب معمول مجھے رکشا تک چھوڑنے

آئی اور چند منٹ ٹھہری ہو کر واپس چلی گئی۔ مگر دوسرے دن جب میں بیوی بچہ تو اس نے
دو چار رسمی باتوں کے بعد رکشا والے کے متعلق باتیں دریافت کیں مثلاً یہ رکشا والا تو کمرہ ہے
کیا؟ کیاں ہے؟ کیسی رکشا چلاتا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تو یہی نہیں!! وغیرہ وغیرہ
مرشد اب روتے ہوئے مجھے جھوٹے آئی اور کافی دیر تک ٹھہرتی۔ مجھ سے بات کرتے کرتے
وہ ایک ادھر مرتبہ رکشا والے سے بھی کچھ فضول سوال کر لیتی۔ کبھی کہتی رکشا والے! ذرا
رکشا ہو شیاری سے چلانا، کبھی کہتی ”تم رکشانہ جیلا کرو“ خطرہ ہوتا ہے۔ اور اگر شہر باوجود
ایک بار دریافت کرنے کے کہ رکشا والے کا نام جو ہے اس کا نام باپا رکھتی مرشد
بات مجھ سے کرتی مگر نظریں اس کی جو پیر ہی رہتیں۔ اب مرشد کی گفتگو کا موضوع صرف
جھوٹکا۔ مجھے چھیڑتی۔ ذرا سنبھل کر رہنا حمیدہ بیگم! رکشا والا ہے غضب کا۔ خدا خیر کرے۔
کس پیر جموں کوئی نیا شگودہ نہ کھلانے۔ ”مگر اس نے ان جملوں نے مجھے اس کے دل
کی دھڑکن سنائی دیتی۔ اس کی نظریں اس کے دل کی ترجمانی بن جاتیں اور میں ہاں ہوں کہے
ٹال جاتی مگر اس کے متواتر اصرار پر اور ہر وقت جھوٹے ذکر سے کچھ خوف ہونے لگا اور میں
نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اس سے پوچھوں گی کہ آخر رکشا والے سے مرشد کو اس قدر دلچسپی
کیوں ہے۔ کئی بار کوشش کے باوجود میں ارادہ میں ناکام رہی۔ لیکن ایک دن جب کہ وہ رکشا والے
کے حلیہ پر اس کی شکل پر ایک شاعرانہ تبصرہ کر رہی تھی میں نے اس سے پوچھا ”مرشد
ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گی؟“ میرے اس سوال سے وہ کچھ سیٹھا سی گئی۔ مگر میں
نے اس کی گھڑا ہٹ کی پرواہ کئے بغیر اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس کو ہر وقت رکشا والے
کی فکر کیوں رہتی ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے تو اس نے ناگواری کا اظہار کیا لیکن شاید
اب اس میں بھی اپنے راز کو راز رکھنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ اس نے اہتمام سے گلے میں ہاتھیں
ڈال دیں اور بہت ہی کرب کے ساتھ کہنے لگی ”حمیدہ! مجھے ہمارے رکشا والے سے بہت

محبت ہے۔ اچھی حمیدہ خفانہ ہونا۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت اسی کی باتیں
 کروں۔ اسی کو دیکھوں اور نہ جانے کیا کیا جی چاہتا ہے۔ حمیدہ! کاش تم میرے
 احسانات کو سمجھ سکتی مرشد کے لفظ ”محبت“ میری چونک پڑی۔ پریشان ہو گئی۔ ناف
 ”محبت ایک رکش والے سے۔ سماج ہرگز مرشدہ کو اس محبت کی اجازت نہ دے گی عجیب
 عجیب خیالات میرے ذہن میں آنے لگے۔ میں نے اس کو سمجھا یا کہ وہ غلطی پر ہے۔ دنیا بڑی
 جگہ ہے۔ یہاں مرشدہ جیسی لڑکی صرف ایک بڑے خاندان سے کر سکتی ہے محبت! دولت مند
 کو ایسا محبوب بنا سکتی ہے۔ یاں دولت مند چاہے کسی ذات کا کیوں نہ ہو۔ سماج اس
 محبت پر آفرین کے نعرے لگانے کو تیار ہے۔ لیکن ایک رکشا چلانے والا ادنیٰ سے
 ادنیٰ ذات کا بھی محبت کے لائق نہیں ہو سکتا میں نے کہا کہ ”مرشدہ! تو غلطی پر ہے
 خدا کے لئے اپنے اور جمو کے حال پر رحم کر۔ تو جمو کو ہمیں پاسکتی سماج کے ظالم
 ہاتھ اس سے پہلے کہ تیرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہو جمو کے گلے پر ہوں گے۔ اس کی نعش
 بھی جھکو نہ مل سکے گی“ میری ان سب باتوں کا مرشدہ پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ میری طرف
 سے بدگمان ہو گئی۔ اس نے ایک درد اور بے چینی سے کہا ”حمیدہ! تم کتنی خوش قسمت
 ہو کہ جموں تم کو رکشا والے کی حیثیت سے ملا اور تم اس سے ملتی ہو۔ اس سے بات کرتی ہو۔
 تم کیا چاہتی ہو۔ کیا تم اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہو؟“ اس کا مرشدہ نے
 صرف اس قدر جواب دیا کہ وہ خود نہیں جانتی کہ وہ کیا چاہتی ہے ؟

خلاف معمول آج مرشدہ بہت ہی خاموش تھی۔ یوں تو جمو کی یاد نے اس کو
 بے چین کر رکھا تھا مگر آج وہ بہت ہی روہانسی ہو رہی تھی میں نے وجہ پوچھی تو اس
 نے بتایا کہ آج اس کے مرحوم بھائی کی ۲۲ ویں برسی ہے۔ آج ہی کے دن اس کا بھائی

جب کہ پانچ سال کا تھا ایک سفر میں ریل کی بڑی برکٹ کر مر گیا تھا میں نے اس کے پاس میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہ پوچھا اور اقبال افسوس کرتے گئے۔ آج کالج کے بعد مرشد مجھے رکشا تک چھوڑے نہ آئی۔ جمو نے اس کو محسوس کیا اور اس کے نہ آنے کی وجہ بہت ہی ڈرتے ڈرتے دریافت کی۔ جمو کے سوال سے مجھے اور بھی فکر ہوئی، کہیں جمو تو مرشد کی طرح اس کو نہیں چاہتا۔ دوسرے روز جب میں کالج جانے لگی تو میں نے راستے میں جمو سے پوچھا کہ اس کا ہاتھ کیوں کڑکٹ گیا تھا اور وہ کہاں رہتا ہے۔ آیا اس کے مال یاپ ہیں یا نہیں۔ خیر یہ سوالات تو تہمید تھی۔ میں تو کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی جمو نے بتایا کہ جب وہ پانچ سال کا تھا۔ اس وقت اس کا ہاتھ ریل سے کٹ گیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ دوریوں کی ٹکر ہو گئی تھی اور اسی حادثے میں اس کے مال یاپ بھی ختم ہو گئے۔ اسٹیشن کے ایک قتلے نے اس کی پرورش کی۔ اب بھی وہ اسی کے پاس رہتا ہے۔ قلی بوڑھا ہویا کا ہے اسی نے یہ رکشا چلانے کا کام کرتا ہے۔ اس کے یہ حالات سن کر نہ جانے کیوں مجھے مرشد کا خیال آیا اور ساتھ ساتھ اس کے بھائی کا بھی۔ مگر میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اگر جمو مرشد کا بھائی ہوتا تو پھر مرشد یہ کیوں کہتی کہ اس کا بھائی مر گیا، لیکن ان باتوں کے معلوم کرنے کے بعد آگے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کالج آگے ایک خالی گھٹے میں میں نے مرشد سے اس کے بھائی کا نام پوچھا جو اس نے جھپٹ بٹایا۔ پھر میں نے اس کے بھائی کا قبر دریافت کی تو ایک سرداہ کے ساتھ اس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی بھائی کی موت میری پیدائش سے قبل کا واقعہ ہے۔ بھائی کی نعش نہ ملی تھی لیکن ظاہر تھا کہ اتنے لوگ مرے تھے اس میں پانچ سال کا بچہ کیسے بچ سکتا تھا۔ جس وقت ریلوں میں ٹکر ہوئی ہے۔ جمیل بھائی قند کر کے نوکر کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ نوکر کی نعش تو ملی مگر بھائی کا نہ ملی۔ اتنی جان کو اس کا بہت مدد مسیکہ انکا بچہ بے گور و کفن رہا۔ اتنا حال بیان

کرتے کرتے مرشد بہت رونے لگی۔ اس کی دلجوئی کی خاطر میں نے جمو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کا نام آتے ہی وہ کھل اٹھی۔ میں نے کہا ”مرشدہ! اگر تم کو جموں جاسے تو کیسا کر دو گی؟“ کہنے لگی ”اس کو اماں کے پاس لے جاؤں گی۔ اس کی تعلیم کا انتظام کروں گی۔ اور پھر۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اتنا کہتے کہتے وہ رک گئی اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اور اس طرح کہہ رہی تھی گویا اس کو ان سب باتوں کے پورا ہونے کا یقین تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ کتنی بھولی ہے مرشدہ اس کو کیا معلوم کہ اماں کے پاس جاتے ہی جمو کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اس کو شہر بدر کر دیا جائے گا۔ اور پھر مرشدہ اپنی تمام آرزوؤں کے جنازے پر آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے گی۔

کئی دن میرے پریشانی میں گزر گئے۔ جمو اور مرشدہ دونوں سے بچے ہمدردی تھی۔ مجھے جمو اور مرشدہ دونوں کی کہانیاں یکساں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر ہر زاویہ نگاہ سے مجھے سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا۔ ایک دن اچانک مجھ کو خیال آیا کہ کہیں جمو مرشدہ کا بھائی تو نہیں؟ اور اس خیال نے میرے دل و دماغ دونوں پر قابو پا لیا۔ جمو کی کہانی مرشدہ کو سنانے کا میں نے پکا ارادہ کر لیا۔ اور جب اگلے دن کالج گئی تو یہ بات میں نے اس کو بتا دی۔ اس بات کو سن کر پھولی نہ سمائی جیسے سچ پر جمو اس کا بھائی ہو۔ آج مرشدہ وقت سے پہلے گھر پہنچ گئی۔ اور غالباً اس نے جمو کا حال اپنے والدین سے کہہ دیا۔ کیوں کہ جب وہ کالج آئی تو کہنے لگی ”آج تم اور جمو معاً اس قلی کے ساتھ جس نے جمو کی پرورش کی ہے میرے یہاں آنا۔ اور چلتے چلتے تاکید کر گئی۔ چنانچہ شام کو جب جمو آیا تو میں نے قلی کو بلانے کے لئے کہا۔ لیکن معلوم ہوا کہ قلی سخت بیمار ہے۔ یہ حال میں صرف جمو کو لے کر مرشدہ کے گھر پہنچی۔ وہاں بہت اہتمام تھے۔ بہت ہی یر تکلف چائے کا انتظام تھا۔ مرشدہ کی اتنی

کی بے حسنی دیکھنے کے قابل تھی۔ یاد بار بار جلس سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ جمود دنیا اور مافیہا سے بے خبر رکھتا میں دونوں گھٹنے سے پیٹ لگائے کسی گیرے خیال میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ امی سے اب ضبط نہ ہو سکا اور جلس کے پاس بلا کر اس سے سوالات شروع کر دیئے۔ میں اور مرشدہ امی کے پیچھے کھڑے ہوئے بڑے شوق اور اشتیاق سے باتیں سن رہے تھے۔ مرشدہ کی بے حسنی کچھ عجیب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بغیر کچھ پوچھے ہی جو کو بھائی تسلیم کرنے کو تیار تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ وہ جو کو کسی اور نگاہ سے پوچھتی ہے۔

جوتے دیسی باتیں جو مجھ کو بتانی تھیں امی کو بھی بتا دیں۔ برآمدے میں اباء مرشدہ کے والدہا ہر بات کو خور سے سن رہے تھے۔ کہانی سنکر فوراً موڑ نکلوائی۔ اور جو کو ساتھ لے کر قلی کے پاس جا پہنچے۔ قلی نے بتایا کہ ریل کی ٹکڑ میں بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کو نہ پہچان سکے اور گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اس طرح ٹکڑ ہونے کے تین دن کے بعد جو اس کو ملا۔ مگر بے ہوش۔ قلی کے اولاد نہ تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ جو کے ماں باپ حادثے کے تازہ ہوجائے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی گاڑھی کمائی جو شاید قدرت نے اس بچے کی زندگی رکھنے کے لئے اس سے جمع کروائی۔ جو اس نے اس بچے کے علاج میں صرف کر دی۔ بچہ نے ایسا نام جمیل بتایا تھا۔ اس سے آگے بتانے کی اس میں کچھ سمجھ نہ تھی۔

اس بیان کو سن کر آبانے بے اختیار قلی کو سینے سے لگا لیا۔ امی نے پردے کے پیچھے سے بہت سی شکریہ ادا کیا۔ اور دعا میں دیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ جس کو دیکھنا ایک بہت ہی دل والے کام تھا۔ میں اور مرشدہ بھی موڑ ہی میں بیٹھے تھے جو ایک کونے میں بہت دیر بیٹھا تھا۔ آبانے اس کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی کو چومنا۔ مرشدہ نے جھٹ اتر کر گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ماں نے ہزاروں بلائیں لیں۔ آج

بائیس سال کے بعد یوٹے باز دوں میں پھر سے جان پڑ گئی۔ باپ کے بڑھاپے کی ٹینک ماں کی آنکھوں کا تارہ ایک بھیڑیائی ادب بیوندہ لگا خاکی نیسکر پہنے ماں کے سینے سے لگا ہوا۔ دو رہا تھا۔ من اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی جن کو برسوں سے تیل نصیب نہ ہوا تھا۔ قلی اپنی گاڑی کئی کے ٹمر کو یوں ہاتھ سے جالتے دیکھ رہا تھا جس کی خدمت میں اس نے رات دن ایک کر دیے تھے۔ قلی کے چہرے پر مسرت اور حیرت کے طے جلے اثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ باپ نے کہا "قتل! آج سے تم ہمارے بھائی ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ جمیل تم سے چھوٹ جائے گا۔ ہم ارجمیل تمہارا جوہی ہے گا۔ جمیل نے آگے بڑھ کر قلی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اس کے منہ کو چوما۔ اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بابا (قلی) کو اپنا بابا ہی سمجھے گا۔ باپ کے گھر کی روشنی اور یوٹے قلی کی زندگی کا سپہارا بن کر رہے گا۔

موٹر پر قلی کی بھیڑی گڈری اور قلی معہ چیل کہ مرشد کے گھر آگئے آج رات ان کی شب برات تھی۔ مرشد نے اس رات مجھے روک لیا۔ اور امی جان کو کہلا بھیجا کہ میں آج گھر نہ آؤں گی۔ وہ خود آجائیں۔ چنانچہ رات کو سب گھر میں جمع ہو گئے۔ تمام رات رتجگا رہا۔ دوسرے دن ایک بہت بڑی دعوت کے لئے رقعے بانٹ دیئے گئے۔ میں پوچھا "مرشد! پھر!۔۔۔۔۔۔ پھر! کے بعد کیسا ہو گا! مرشد کے منہ سے بے ساختہ نکلا "پھر بھی! میرا سسر سسر ہو جائیں گے اور پھر پیاری سی بھائی آئے گی۔" مرشد کو اس کا بھائی مل گیا۔ وہ اب بہت خوش تھی۔

دو سال ہم کالج میں ساتھ رہے۔ پھر مرشد کی شادی ہو گئی تین چار سال کے بعد جمیل کی شادی میں شرکت کا موقع ملا۔ میں دلہن کے ڈیپے میں چمکا ٹانگ ہی تھی کہ ایک مرتبے سے آواز آئی "بیٹا" رکشا دیر سے دروازے پر کھڑے کیا آج کالج نہ جائے گا! اس آواز کو سن کر میں چونک پڑی۔ بلٹ کر دیکھا تو جو صاحب آسمانی سوٹ پہنے کھڑے بڑے ٹھٹھا مکر رہے تھے۔

ابا جس دن گھر میں ہوتے!

میں ایسی اتمول یادوں کے خزانے سے اس دور کو آواز دے رہی ہوں جب اختیار ”پیام“ تمام محافضوں اور متواتر تہوں کے طوفانی پتھیروں سے گذر کر ترقی کی راہ پر گامزن تھا بلکہ یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کا غفوان شیباب تھا اور ابا اسکو خوب سے خوب تر کی طرف لیجانے میں ہنمک تھے اور ان کا یہی اٹھنا گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کو گھر سے بے خبر رکھتا۔ سوچوں میں اس قدر گم رہتے کہ یہ بھی احساس نہ رہتا کہ کون ان سے مخاطب ہے اور وہ کیا جواب دے رہے ہیں۔

کسی صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا اتفاق سے وہ صاحب آئے تو ابا کو غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اطلاع کی گئی۔ ہاتھ گا دن پہن کر نکلتے اور ڈرائنگ روم کا رخ کیا کرتے وہ تو شکر چھبے کہ گھر والوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی ”ارے بھئی کیڑے تو ہیں لیجئے ہاتھ گا دن میں کہا جا رہے ہیں؟ اور ابا لا حول بڑھتے ہوئے بڑے چلے جاتے اشتر قلم عینک یا سنگریٹ سامنے ہی لٹکے ہوتے اور ابا سامے گھر میں ڈھونڈتے پھرتے فرض ابا گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنی خیالی دنیا میں کھوئے رہتے۔

اس زمانے میں حیدر آباد میں جمعہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی اور گویا یہی وہ دن ہوتا جس دن ابا گھر میں ہوتے تو یوڈی طرح ہمارے درمیان! جموات کی رات سے ہی جموں کی تیاری شروع ہو جاتی میرے لئے تو عید ہو جاتی مٹھاس ہی مٹھاس! جھپٹی کا دن نئے نئے پردہ گراموں سے سجایا جاتا کبھی ہم لوگ پردہ گرام بناتے کبھی ابا کی طرف سے یہل ہوتی!

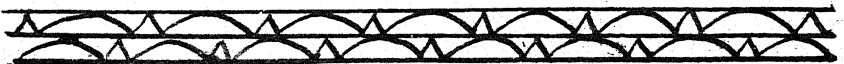
ایک بے حد زندہ دلی، خوش گفتار طبیعت میں سنجیدگی اور جہل کا انوکھا اشتراج ان کی ہر دل عزیز بنی کا صامن تھا۔ چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے لطف اٹھانا اور دوسروں کو بھی اس میں شریک

بنانا ابابا کی خاص خوبی تھی۔ یکنک کے پروگرام بنتے تو ان کو کتاب یا اخبار ہاتھ میں رکھنے کی اجازت نہ ملتی ایسی یا بندیاں لگانے میں میں پیش پیش رہتی انھوں نے اخبار ہاتھ میں لیا اور میں نے چیخا: "بلکہ حکم لگاتی کہ کڑیاں پڑے باغ میں پھینک دیو ریاں تکی جائیگی" لو ریاں بنانے بڑے دھوے سے بیٹھے کہتے "دیکھ کیسی عمدہ پوری بناتا ہوں" اور جو پھر آٹے کی ریڑ لگتی دیکھنے کے قابل ہوتی۔

کبھی تاش کی بازی لگتی کبھی پھسی کی بسٹا بچھ جاتی۔ شطرنج کے تو کھلاڑی مانتے جاتے تھے کبھی سینما کا پروگرام بنتا تو میں ٹریڈی فلم کی رائے دیتی تو کہتے "بھئی زندگی میں کیا کچھ کمی ہے ٹریڈی کی جو فلم بھی روتے ہوئے دیکھا جائے۔ بھئی کوئی مسخری قسم کی کچر ہو جائے آج تو ابابا کبھی تقہمہ مار کر نہیں بیٹے تھے۔ کچر میں ہم لوگوں کا ہنسنے پتے برا حال ہو جاتا اور ابابا مسکرا ہٹ سے آگے نہ بڑھتے۔

کلاسیکی موسیقی میں ابابا کو راگ بھرویں بہت پسند تھا اور ساران کا دل پسند ساز تھا اور لوگ گیت سن کر تو کھوسے جاتے امیر خسرو کا بابل سنستے تو آیدیدہ ہو جاتے لوگ گیتوں کے لئے کہا کرتے تھے ان میں معصوم اور پاکیزہ دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ جس دن یکنک یا کچر نہ ہوتی تو گھر پر درجہ ہر کوئندہ کھانا بنتا سیٹھا اور آم ان کی کزدری تھے اگر ان کے سامنے ایک آدھ آم کھا کر ہاتھ روک لےتے تو کہتے تھے اس طرح آم کی تاقدری کرنا ہے تو میرے سامنے نہ نکھایا کر دیں آم کی تو میں برواشت نہیں کر سکتا۔

ان یادوں کو تو بس ذرا سا چیر ڈیکھے ایسی یلغار ہوتی ہے کہ روکنا مشکل ہو جاتا ہے کیا یاد نہیں آتا: "وہ یادگار شاہیں ان کا کیا کہنا واہ۔" بھلا اب ایسی شاہیں کا ہے کو آئیں گی۔



پتھر یادیں

ہر لمحہ اور ہر پل جو گزر جاتا ہے ماضی کے کھاتے میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ قدرت کے اس قانون کو کیا کہئے کہ وقت کے گزرتے ہوئے اس کا روالا کے جو نقوش ذہن کے آئینہ پر ابھرتے ہیں یادوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ انسان جس حال میں جیتا ہے اس سے غیر مطمئن اوریشا کی رہتا ہے اور عجیب بات تو یہ ہے کہ جب ہی ”آج“ گزرے ہوئے کل میں بدل جاتا ہے تو احمول بن جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات کا بہترین مصرف پڑھنا اور لکھنا ٹھہرا۔! میں نہ افسانہ نگار نہ شاعر۔! کبھی لکھنے کی کوشش کی تو ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ یوں بھی میں حال کی پیش کا مقابلہ کرنے کے لئے ماضی کی ٹھنڈی چھاؤں کا سہارا ضروری سمجھتی ہوں۔ میرے لئے ماضی سے رشتہ توڑنا آسان نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے جب بھی لکھا ماضی سے مانگ لکھا! میرے نزدیک صرف اپنی تسلی کے لئے لکھنا کافی نہیں، دوسروں کی دلچسپی اور جانے پہچانے لوگوں کی بات بھی ہونی چاہیئے۔ اس مضمون میں بھی میں نے کچھ ایسی ہی کوشش کی ہے۔ سچ پوچھتے تو یادوں کا اکٹھا کرنا کوئی کھیل نہیں کبھی تو انھیں ادھر ادھر سے پکڑنا پڑتا ہے اور کبھی ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی شہر سے چھپیلے کو بکھر کر آپ اس کا سہرا چونا چاہیں تو وہ آپ کی

گرفت سے نکل کر دور جا کھڑا ہوا اور شرارت بھرے لہجے میں کہے، میں پکڑا اور کبھی دوڑ کر خود ہی ہاتھوں میں سما جائے۔

بچپن کی یادیں حسین بھی ہوتی ہیں اور عزیز بھی۔ میری شرارتوں کا سلسلہ بچپن کی حدیں پار کرنے کے بعد بھی بہت دن تک جاری رہا میں شرارتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی لیکن خالہ بی کے ایک جملہ کی خاطر اتنا ضرور کھنایا پڑے گا کہ میری شرارتوں کے اگے بے بس ہو جائیں تو بے اختیار پکار اٹھیں ”یا اللہ میری بچی کو سنجیدگی عطا کر“ ان کی دعا قبول تو ہوئی لیکن ہماری سنجیدگی کا فیض ان کو نصیب نہ ہوا اور ہوتا بھی کیسے کہ ہمارے قہقہے تو انھیں کے ساتھ دفن ہوئے کیا یہ ممکن تھا کہ وہ زندہ ہوتیں اور ہم میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی۔ یہاں تو نازکمر سے نازیر دار کے ساتھ والا معاملہ تھا۔! آج بھی کسٹن لڑکیوں کے قہقہے سنتی ہوں تو خالہ بی کی دعا کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور میں گھر کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتی ہوں اور اللہ پاک سے التجا کرتی ہوں ”اللہ میاں تو خالہ بی کی دعا قبول نہ کر ان بچیوں کے قہقہے اور طویل کر دے کہ یہ بزرگوں کی زندگی کی ضمانت ہیں۔!۔!

سچ میں نہیں آتا ماضی کی ان رومان پرورد داستانوں کو کہاں سے شروع کروں چلیے بچپن ہی کا سہارا لیتی ہوں۔ یہ لکھنؤ ہے۔ میرے بچپن کی بہت سی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں ”کرامت حسین گز لڑکا لچ جو اس زمانے میں مسلم گز لڑبائی اسکول کہلاتا تھا سات سال کی عمر میں میں یہاں داخل ہوئی پور ڈنگ میں رہتی تھی۔ یہ اب بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔ مل جل کر جینے کا سلیقہ اس کی دین ہے چھپر والا اسکول اس کے ماسٹر صاحب اور دیدی جن کی شفقتیں سر پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ دوستوں کے معاملہ میں ہمیشہ بڑی خوش نصیب رہی۔ ایک چہرہ

ذہن کے پر سے برا بھلا ہٹا دیا یہ سنانولی سلونی تھکے نقش و نگار والی لڑکی میری
 عزیزہ سہیلی تھیں۔ میں عمر میں اس سے بڑی وہ کلاس میں مجھ سے بڑی جی ہاں
 اس نے بہت کم عمری میں اور تیزی سے تعلیمی مراحل طے کئے۔ ہم دونوں کے اسکول
 الگ الگ تھے اکثر لوگ سمجھتے ہیں ہم اسکول کے ساتھی ہیں۔ ہم نے کبھی ایک
 اسکول میں بھی ساتھ نہیں رہے ہماری دوستی ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے جن کے پاس
 دوستی کا سلسلہ خاندان در خاندان چلتا تھا۔ اور رشتہ دار میں تیر کرنا مشکل ہوا کرتا
 تھا۔ کیا دن تھے وہ بھی ڈسمبر کا مہینہ اسکول کو تعطیلات وہ بھی بین سفٹے کی اور کیا
 چاہیے۔! کبھی میں ٹھیکے کے گھر اور کبھی وہ میرے یہاں آجاتی گھر کے وسیع لان کے
 ایک گوشہ میں سایہ دار درخت کے نیچے ہم ڈیر اڈال دیتے اور پھر خدا جانے کیا
 کیا باتیں کرتے اپنی ہی باتوں پر خود ہی حیران ہوتے اور کبھی سوچ میں ڈوب جاتے
 اس عمر میں ہر چیز نئی اور انوکھی لگتی ہے اختیار اس کی تہہ میں اتر جانے کو جی چاہتا۔
 باتوں کا خزانہ ختم ہوتا تو ہمارے مونیٹ لے کر بیٹھ جاتے یہ ہمارے مونیٹ اتنا چھٹا تھا کہ ہمارے مونیٹ
 کا پچھ لگتا تھا ٹھیک اب بھی اس کی تحریر پوچھتی ہیں۔ یعنی بجاتی بھی اور گاتی بھی
 اکثر فلمی گانے چلتے ہماری آواز بھی شامل رہتی۔ رفتہ رفتہ غزل پر اتر آتے
 کبھی شاخ و سبزہ دیرگ پر کبھی غنچہ دگل و خار پر
 میں چین میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

یہ اس زمانے میں ان کی پسندیدہ غزل تھی اور اس قدر خوبصورت انداز میں گاتی
 کہ جی چاہتا وہ گاتی ہی رہے۔ اللہ پاک نے عینی کو فنون لطیفہ عطا کرنے میں بڑی
 قیامت سے کام لیا۔ اس کو جتنا اپنے قلم اور علم پر اعتماد ہے اتنا ہی دوسرے فنون
 میں بھی دخل ہے موسیقی، رقص، اداکاری، مصوری ان میں سے کسی کو بھی ایسا ہی تو
 اتنا ہی نام لگاتی جتنا آج ادب کا ہے۔ پھر حال جب گلے بازی سے تھک جاتے تو

دونوں لان پر ادھر سے لیٹ جلتے پھول انہیں سامنے پچھالیتے اور مطالعہ شروع ہو جاتا ان ساری مصروفیات کے باوجود کان ہر وقت خوابچہ والے کی آواز پر سرگے رہتے کبھی گٹر کی لیا خریدی جا رہی ہے تو کبھی کچا لو اور چائے ابھی سو نہ کے بتاتے ختم ہنس ہوئے کہ مونگ بھلی کی سو نہھی سو نہھی خوشیوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا عرض سارا دن منہ بھی چلتا اور زبان بھی شام کو جب بھنی چلی جاتی اور میں آیا کو تلم دن کی پورٹ دیتی تو جیو پرن کی فرست سن کر آیا دہل جاتیں۔ کتنی ہر نہ تجھے سمجھایا کہ بازار کی چیزیں غصنی کو مت کھلایا کر خدا نہ کرے اس کی طبیعت خراب ہو گئی تو نذر خالہ میری جان کو آجائے گی۔ دیکھو کہ دیتی ہوں اگر آئندہ کسی خوابچہ والے کو گپیٹ کے اندر بلایا تو خالہ سے کہہ کر بھنی کا یہاں آتا بند کرادو گی۔ نذر خالہ بڑی دھڑی رہتی تھیں انھوں نے کئی بچوں کا دلغ چھیلا تھا اب ان کے دل میں اتنا ڈر بیٹھ گیا تھا کہ وہی ہو چلی حد سے زیادہ محتاط رہتی تھیں اور بچوں کو بلے حد پر سیز کراتی تھیں اسی لئے آیا مجھے بھی تینہ کرتی رہتی تھیں۔ اب یہ اوہ بات ہے کہ ہم ان کی باتیں سننے تو بڑی سعادت مندی سے تھے لیکن عمل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ بقول حالی ”بچین کا زمانہ جو کچھ حقیقت میں بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے پر فضا میدان میں گندا جو کلفت کے گرد و بفار سے بالکل پاک تھا۔ لیکن نہ جانے اس بادشاہت کو کس کی نظر کھا گئی کہ ہم یوں بچھڑے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے کون جانے دقت کی آندھی کتنوں کو کہاں سے کہاں اڑا لے گئی ہماری دوستی ماضی کا خواب بن کر رہ گئی۔

میر سجاد حیدر اور نذر سجاد کی آنکھوں کا نور دیناے ادب پر قرۃ العین حیدر سید بن کر نمودار ہوئے۔ اس کی شہرت بڑھتی گئی ادبی محفلوں میں جہرچہ ہونے لگے میں سنتی خوش ہوتی اور خاموش رہ جاتی نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہوا کہ وہ مجھے بھول گئی۔ اور میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دینا نہیں چاہتی تھی کہ کہا جاتے ہیں

صاحب مشہور سستوں سے تو لوگ کھینچ تان کر نانا جوڑ ہی لیتے ہیں۔

پھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ایک مشاعرہ میں جس میں ساحر لدھیانوی بھی شریک تھے جانے کا موقع ملا جیلانی بانو (مشہور افسانہ و ناول نگار) میرے قریب ہی بیٹھی بھیت اپنا تعارف کرنے کے بعد انھوں نے پوچھا ”آپ قرۃ العین حیدر کو جانتی ہیں“ اس اچانک سوال پر میں سیٹھاسی گئی اور کوئی معمول جواب نہ سوچھا تو کہنا پڑا ”جی ہاں جانتی تو تھی“ جیلانی بانو نے بات آگے بڑھائی ”میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ عینی آپا کا خط آیا تھا انھوں نے لکھا ہے میری بہت پیاری سسلی فاطمہ حیدر آباد میں رہتی ہے اس سے تو تو میرا بہت بہت پیار و سلام کہنا“ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا یہ میں کیا سن رہی تھی خوشی اور حیرت کی اس وقت جوبلی جلی کیفیت تھی اس کو شاید میں الفاظ نہ دے پاؤں۔ شہرت کی اتنی بلندیوں سے اس نے اپنی گناہ سسلی کو پیار بھیجتا تھا۔ جہاں میرے لئے ایک خوشگوار اور انوکھا تجربہ تھا وہیں جیلانی بانو سے پہلی ملاقات بھی یادگار بن گئی بلکہ خلوص و پیار میں ڈھن گئی جب عینی بمبئی آگئیں تو حیدر آباد آنے والوں کے ہاتھ عینی کے سلام و پیار کے تحفے ملتے رہے۔

۱۹۷۱ میں میرا بمبئی جانا ہوا۔ IMPRINT کے دفتر فون کیا میری آواز سن کر عینی نے پوچھا کیا تم فاطمہ بول رہی ہو ۲۴ سال بعد فون پر میری آواز پہچان لینا واقعی کمال ہے۔ اور پھر جب ہم ملے تو جیسے یحییٰ لوٹ آیا نہ کتابوں کی باتیں ہوئیں نہ کھنے پینے کی بس پرانی یادیں بھیتیں اور ہم تھے عینی کوئی پرانی بات شروع کرتی میں جلد پورا کر دیتی میں کوئی قصہ چھیڑتی تو وہ اس کا سراخ تمام لیتی ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اسے ہم لوگوں کو تو سب یاد ہے ملاقاتیں اب بھی سالوں پہنچتی ہیں مگر پیارے پیاروں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے

سوچوں گے دھواں۔ میرا ایک اور یاد ابھر رہی ہے جی پاپا بتا ہے

سب کو شریک رکھوں۔ چائے اس بگڈنڈی تک جلیں جس کو شملہ کہتے ہیں اور یہ بگڈنڈی اس گھر تک جاتی ہے جہاں ہم کسی زمانے میں گرمیاں گزارنے آیا کرتے تھے اس گھر کا نام THE RETREAT تھا آزادی کے بعد اس کی بڑی تاریکی حیثیت ہو گئی تھی۔ اندرا بھٹو ملاقات اور شملہ معاہدہ اس گھر میں ہوا تھا کہتے ہیں شملہ معاہدے کے چند دن بعد ہی یہ گھر نذرِ آتش ہو گیا کیسے ہوا اللہ بہتر جانتے ہیں تھاندار گھر خود شملہ بھی بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ قدرت نے حسنِ بخشنے میں بڑی دیرپادلی سے کام لیا ہے۔ ہر سال داسرے یہاں گرمیاں گزارنے اپنے لیے چلے کے کاتھ آیا کرتا تھا اسی لئے ماموں میاں بھی آتے تھے۔ اس سال وہ وزیرِ تجارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اس لئے ذرا اٹھاٹ باٹ کچھ زیادہ ہی تھے۔!

یوں تو ہر سال شملہ آتے تو گھر ہماروں سے بھر رہتا لیکن اس سال یوں سو نوم ہوتا تھا جیسے آسمانِ ادب کے چاند سورجِ حمارے انگن میں اتر آئے ہیں یہ دہلی بیتی گندمی رنگت غلنے اور سرخی سے آراستہ چہرے والی اپنے زمانے کے جدید طرز کی دوہرے بل کی ساری میں ایسی پیٹائی ہماری جہان بھٹس حجاز امتیاز اپنے زمانے کی لکھنے والیوں میں متفرد انداز کی حامل ان کی کہانیوں کے بعض کردار جیسے بوڑھی زونڈاش اور بھوبنی زبیرہ ابھی تک یاد ہیں۔ لیکن بیت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ حجاب کو دنیا کی یہی مسلمان ہو یا ز خاتون کا اعزاز حاصل ہے ۱۹۳۶ء میں ان کو ہوائی جہاز چلانے کا سرٹیفکیٹ ملا تھا۔ ادیب مالیکا نوی نے منظوم مبارک یاد پیش کی تھی چند شعر نقل کر دوں تو فرورِ لچھی کا باعث ہوں گے۔ اس نظم کا نام تھا حجاب کی ہوابازی پہلا شعر تھا۔

کیا حجاب کی جرأت نے بے حجاب یہ راز
 کبے قفس کے اسیروں میں طاقتِ پرواز
 تو ہاتھ لگھیرا ہو جس کو صدیوں سے
 یہ واقعہ بھی ہے اس قوم کے لئے اعجاز
 یقیناً اصلِ قدرت کو نہیں اسکا
 "کنیز خانہ" کہاں اور کہاں ہوائی جہاز
 ہزار فخر کے قابل ہے کامرانی شوق
 ملے رکھ دیئے اندیشہ ہائے دور و دراز

ہم سوچتے ہیں تحقّق کی پرواز کے آگے بچا ہے ہوائی جہاز کی اڑان کی
 حقیقت ہی کیا ہوگی۔ انھیں دیکھئے دو ہر جسم دراز قد چوڑی پیشانی ہنسی
 آنکھیں سوئڈ بوتل یہ سراپا ہے سید امتیاز علی تاج کا ان دونوں سے لگی گھڑی
 ہیں ان کی لاڈلی 2 سالہ یا سیمین جوار دو امیر انگریزی میں بات کرتی ہیں۔
 والدین کا جاری کردہ تہذیب نسواں اور پھول کی ادارت تاج صاحب ہی سمجھالے
 ہوئے تھے آج تک ان پرچوں کو یاد کیا جاتا ہے ڈرامہ انارکلی اور چچا جھکن تاج صاحب
 کی وہ تخلیقات ہیں۔ جنہوں نے ملک میں دھوم مچا دی تھی۔ تاج صاحب کی بھتیجی
 حمید صاحب کی لڑکی شریجو تقریباً میری، ہی ہم عمر ہے حد ملنا رہے باقی کی حد تک
 بے تکلف خوش شکل اور بھوپنی اور میری مائی سے بہت مشابہت ملتی ہے۔
 ملبوس نفاست الملیقہ اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ سب لوگ لاہور
 سے تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں لاہور ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔
 ان لوگوں کو دیکھ کر یقین آگیا۔

یہ تین عدد مراد آباد سے تشریف لائے تھے یہ تھے راجن پیا ان کے

نام کے ساتھ یار ایٹ لاکھا جاتا تھا ہمارے خاندان کے یہ پہلے فرد تھے جو تعلیم کے لئے
 دلایت گئے تھے وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی خاندان والے ان کو اس طرح دیکھتے تھے
 جیسے کوئی عجیب الحقت چیز ہوں۔ ان کے دونوں لڑکے حامد بھائی اور محمود بھائی
 بھی ساتھ تھے دفع قلع کے اعتبار سے صاحب بہادری میتوں پر ختم بھی ہذا کا شکر ہے
 مزاج ہندوستانی رہا۔ پھر یہ بدن کھلتا ہوا رنگ مختصر سی سیاہ دائرہ سی سیاہ ذہنیں
 مثالوں پر لہرائی ہوئی سیاہی مائل ستر ڈھیلا ڈھالا لباس گلے میں مغز کی طرح رد مال پڑا
 ہوا جو گورشیہ لڑیانی آنکھوں کی شوخی کو سرے کی لیر کے تیر تر کر دیا تھا غرض فغری
 میں امیری کی ان بان لئے بات پائیت ہتے ہناتے تشریف فرمائے تھے حضرت خواجہ
 حسن نظامی "نظامی بسری کے خالق قلم کے بادشاہ صوفی منش۔ انشا بردازی
 کے جوہر دیکھتے ہوں تو "اُو" بڑھئے بے جان کو جاندار ہوتے دیکھتا ہو تو دیا سلامی
 پر نظر ڈالئے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم منادی میں روز نایچہ پڑھئے۔ قابل مبارک باد
 میں خواجہ حسن ثانی نظامی کے اپنے والد بزرگوار کے روز نایچہ کو دہرا ہے میں جسکی
 تاریخی حیثیت بھی ہے۔ اور تو سب کچھ نہ کچھ رشتہ ہے لیکن خواجہ صاحب دوست
 تھے اس زمانے میں سچ مچ کے دوست ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے
 روز نایچہ میں لکھا تھا۔ "مولانا محمد یعقوب گول میز کانفرنس کی کمیٹی کے کاموں میں
 مصروف ہیں ان کو بھی سر شفیق کی طرح بعض لوگ سرکاری خیر خواہی کے طعنے دیتے
 ہیں۔ مگر جب سر یعقوب دنیا میں نہ ہونگے تو یہی طعن کرنے والے ماتم کریں گے اور
 گیس گے کہ یعقوب رات دن مسلمانوں کے لئے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور ان کے
 دل میں قوم کی محبت کا شعلہ ہر وقت بھڑکتا رہتا تھا۔ یہ تھے تاثرات خواجہ صاحب
 کے ماموں میاں کے بچپن کے دوست ہم وطن اور ہم جماعت سر رضا علی موہانی ہندوستانی
 نثر افریقین بیوی اور سالی کے ساتھ موجود تھے پھرے تو تھے کاٹیج میں لیکن زیادہ

وقت ہمارے ساتھ ہی گذرتا تھا۔ شعلہ کے وہ دن یاد گار بن گئے۔ دن پھر سیر سیلے کرتے یگڈ نڈیوں کے راستے پہاڑوں کی تہراتے کبھی باغوں میں گھس کر بھیل توڑتے بلا سے باغ کسی کا ہو۔ اسٹرکوں کے کنارے گے ناشپاتی کے درختوں پر لنگوروں کا پیراڑ ہوتا بھیل توڑنے کی کوئی صورت نہ نکلتی تو ایک پتھر لنگوروں کی طرف اچھاں دیتے پس پھر کیا تھا کچھ کچی ناشپاتیوں سے لنگور پتھر اڑ کر دیتے چوٹیں کھاتے جاتے اور بھیل چتے جلتے اس طرح رخت سفر ساتھ لے کر کسی گھاٹی کی طرف مڑ جاتے ان دنوں میرا مٹاپا انتہا پر تھا دونازک قسم کی خواتین کے درمیان جو اور بھی نمایاں ہو جاتا اور مجھ میں احساس کمتری پیدا ہونے لگتا اور محمود بھائی تو ہر وقت میرا موڑ خراب کرتے میرے بہتے پہاڑی رستوں کے اتار چڑھاؤ سے گزرتے ہی محمود بھائی ہانک لگاتے "اے بھائی مر مرؤں کا تھکلا کسکا ہے۔ وہ دیکھو سامنے لڑھکتا جا رہا ہے میں بگڑے سرک بڑھی بیٹھ جاتی" چابیئے میں نہیں آئی آپ لوگوں کے ساتھ اور آئندہ بھی نہیں آؤں گی" محمود بھائی انجان ہو کر پوچھتے "اے تو یہ تم بھتس بھی معاف کر دو دھوکہ ہو گیا تھا۔ کان پکڑ کر تو یہ کرتے اور قافلہ آگے بڑھ جاتا نہ وہ پتھر نے سے باز لے نہ ہم اپنے ہمدرد قائم ہے۔ موسم زیادہ سرد ہو جاتا یا بارش ہو جاتی تو گھر پر ہی انگٹیاں سلگانی جاسیں کڑھائی جڑتی اچھا فاصلہ ساون کا ماحول بن جاتا۔

آئے دن پکنک کے پروگرام بنتے کبھی کسی باغ میں کبھی کسی وادی میں کبھی چٹانوں میں ایک دن یوٹریز ہل جانے کا پروگرام بنا۔ یوٹریز ہل کی طرف جو راستہ جاتا تھا اس پر ایک چکنی تنکے کا گھاس۔ کبھی ہوتی تھی اس پر چلنا گویا پل سراط سے گذرتا تھا چکنی گھاس اس پر راستوں کے نشیب و فراز چلتے تو دو قدم لگے تو چار قدم سمجھے ہر قدم پر تلا بازی کھا جانے کا ڈر کسی کا پاؤں پھسلتا تو ہتھ پلند

ہوتے قدم اور ڈگسکا جلتے ماتے، ہنسی کے توازن پر قرار رکھنا مشکل ہو جاتا بہر حال گہرے سنبھلنے کسی طرح منزل تک پہنچ ہی گئے۔ یہ بڑا بڑا فضا مقام تھا ایک جھوٹا سا رستوراں بھی تھا انگریزوں کا سلیقہ اور تفاسست یہاں بھی موجود تھی، باوردی، لوٹے، بلڈر مستقدی سے جا بجا بھی میزوں پر ڈیوٹی انجام دے رہے تھے، ہم سب کا ایک میز پر سامنا مشکل تھا اس لئے دو میزوں پر قبضہ کیا گیا۔ رفا علی چچا بے حد زندہ دل انسان تھے ان کی میز ہماری جگہ سے ذرا اونچی تھی۔ اپنی میز سنبھالتے ہی تان لگائی ”راجرہ راجہ اوپر بی بی نیچے“ اس حرکت سے سب کی توجہ کامرکز بن گئے۔

کھیل کود کی جگہ کے علاوہ جموں بھلی بیڑے تھے رفا علی چچا نے جموں پر جھونکو کا مقابلہ رکھ دیا کہ دیکھیں کس کا جھونکا سب سے اگے رہتا ہے خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس وقت ان کی عمر 56 یا 57 سال رہی ہوگی، ہمارے نزدیک وہ جھولا جموں نے کی عمر یاد کر چکے تھے اور اس وقت ان کا جھولا جھولنا گویا بوڑھے سہاسے کے مصداق تھا اس وقت یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ ہم بھی کبھی بوڑھے ہوں گے وقت کس طرح بے لگا کر اڑ جاتا ہے۔ اب نوجوان رفا علی چچا کا بدل ضرور ہم سے لے لے ہوں گے۔!

غرض دن یوں گزرتے اور شام کو کبھی حالات حاضریہ بے تھرے ہوتے کبھی خالص ادبی ماحول بن جاتا خواجہ حسن نظامی کا شمار چوٹی کے لکھے والوں میں ہوتا تھا امتیاز علی تاج اور حجاب بھی دنیائے ادب میں معتبر سمجھے جاتے تھے رفا علی چچا کا ”اعمال نامہ راز میں تھا جو بہت بعد میں چھپا۔“

حجاب چچا کے ناول ”ظالم محبت“ کی پہلی قسط ساتھیوں میں شملہ کے دوران قیام چھپی۔ مجھے یاد ہے جیسے ہی سرجہ آیا وہیں سڑیوں پر بیٹھ کر کھولا اپنی کہانی نکالی اور پہلا کام یہ کیا کہ ظالم کو کاٹ کر اس کی جگہ ”دوسر“ لکھ دیا میں انھیں کے قریب

سیٹھی تھی میں نے کہا اے چچی یہ آپ نے کیا کیا کہنے لگے میں تو تورفت نہی نکھتا چاہتی تھی مگر پڑھنے والے کہتے اس ثورت کی زبان کتنی خراب ہے اس نے ظالم نکھتا پڑا۔ شاید ساقی کا دہیر چہ آج بھی ان کے پاس محفوظ ہوگا اور جب اس کو دیکھتی ہوں گی تو یعقوب بھائی کے ساتھ مون پھوٹی بے ڈھنگی سی فاطمہ ان کو فرور یار آجاتی ہوگی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا یہ چہ منادی روزنامہ کے لئے مشہور تھا ہر چھوٹی بڑی اہم غیر اہم بات جھیب جایا کرتی تھی حجاب نے ایک دن پوچھا خواجہ صاحب آپ نے اپنے روزنامے میں میرے بارے میں کیا لکھا ہے ہنس کر مٹھے "میں نے کھلے گلاب کی لٹنی کی طرح نازک بھول کی طرح شگفتہ نام حجاب ہے۔ لیکن بہت بے حجاب ہیں" یہ سن کر حجاب بہت سیٹھا مٹی لیکن جب منادی آیا اس میں اپنی تعریفیں پڑھیں تو خوشی سے پاگل ہوا کھٹیں۔ اسی منادی میں نمود بھائی کا موٹروں سے شوق دیکھ کر ان کو موٹر تو از جنگ کا خطاب دے ڈالا دیکھتے ہی دیکھتے وقت پر لگا کر اڑ گیا ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے شملہ کا یہ سفر ہمارے لئے بھی آخر سفر ثابت ہوا ایسا معلوم ہوا جیسے گل ہونے سے پہلے چراغ کی لو بھڑک کر خاموش ہو گئی ہو۔ کیسے شائستہ، ہنر مند، بادقار اور شگفتہ مزاج تھے یہ لوگ ان کے اقوام میں خود بخود سر جھبک جایا کرتے تھے ۱۹۸۲ء میں جب عینی حیدر آباد آئیں پتھس تو ایک دن جب ہم لوگ لگے وقتوں کا ذکر لے بیٹھے عینی کہتے لگیں "لوگ مجھ سے طنز آکرتے ہیں آپ اپنی تحریروں میں ان گزشتہ لوگوں کو بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرتی ہیں" وہ کہتے لگیں اصل میں کہ دار کے بحران نے ان لوگوں کو CYNICAL بنا دیا ہے" عینی نے بالکل سچ کہا۔ اب نہ وہ محبت و مسرت کے سیکر رہے نہ وہ ہستیاں رہیں جن کو

دیکھ کر ایثار و قربانی کا مفہوم سمجھ میں آتا تھا سب خواب و خیال ہو گئے کہانیاں
بن گئے وہ لوگ! ایسا لگتا ہے خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

معذرت

محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ نے اس کتاب کی تاخیر میں میرے
قصور کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ سیرے گھر کی تعمیر اور شخصی کاموں کی وجہ سے
اس کتاب کی تیاری میں تاخیر ہوئی ہے جس کے لیے میں محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ
سے معافی کا طلبگار ہوں اور اس کتاب میں اگر کہیں غلطی نظر آئے تو درگزر کیجیے گا۔
محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ نے میرے لیے دلی اور قلمی دعا کی
ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد محمود احسن

کیلی گرافر

یادش بخیر

حصہ دوم ”طنز و مزاح“

فاطمہ عالم علی

اکبر الہ آبادی کے نام کھلا خط

میں نے کہا آداب عرض ہے اکبر صاحب

خدا کے لئے اس قدر گھور کر میرے خط کو نہ دیکھئے۔ ادھوا اچھا! میں سمجھ گئی! ادھی
گستاخی ہوئی۔ اس طرح اکبر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک گزارش
ہے آپ سے! آپ ہی سوچیے میں آپ کو دوستانہ انداز سے مخاطب نہ کروں تو پھر جوابات
میں لکھنا چاہتی ہوں کیسے لکھوں گی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اگر چا کا رشتہ لگایا ہوتا تو کیا
ہرج تھا۔ قبلہ! بچا تو چھوڑیے میں تو آپ کو داد بھی کہہ لوں لیکن سوال یہ ہے کہ آپ جیسے
غیر معمولی حضرات کے نام کے ساتھ معمولی سے رشتے ناتے جوڑ دینا کہاں تک مناسب ہے
اب یہی دیکھئے نا اگر آپ کو بجائے اکبر الہ آبادی کے میاں عشرت کے والد کہنے لگیں تو کتنا
عجیب لگے گا۔ یہ رشتے ناتے تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا باپ
یا چچا ہوتا ہے۔ آپ تو وہ ہیں جو ہر کوئی نہیں ہوسکتا یعنی کہ شاعر! اور وہ بھی کیسا کافرف
بھی ہے طنز نگار بھی۔ عالم بھی ہے اور غارف بھی۔ اتنی ڈھیر ساری صفات کو چھوڑ کر آپ
کہیں کہ چچا جان یا دادا جان کہو تو دل گوارہ نہیں کرتا۔ ہاں تو اکبر صاحب ایک بار پھر گستاخی
کی معافی چاہتے ہوئے اجازت چاہتی ہوں "اکبر صاحب" سے مخاطب کرنے کی۔ ویسے سرعہ ہے
جو چاہے سزا دیجئے اور یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ سزاؤں کے قائل نہیں سانپ مے
اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے اصول پر عمل کرتے ہیں آپ تو۔!

بات یہ ہے اکبر صاحب میں یوں تو خط لکھنے کے معاملے میں بہت چور ہوں خط لکھنے
کے خیال بھی وحشت ہوتی ہے۔ لیکن چند دن پہلے ایک میگزین پر نظر پڑی جو اکبر خیر خواہ

جی جی بالکل آپ کا بجز بلا شرکت غیرے آپکا!! اس میں اپنی شان میں اتنا لکھا گیا اتنا لکھا گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ قلم لوٹ گئے ہونگے یوں تو کسی نے آپ کی طرفت پر لکھا کسی نے طنز پر بعض حضرات نے ایکو صوفی بنا ڈالا کسی نے اکبر میں عارف کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کسی اللہ کے بندے کو یہ تو فقیہ نہ ہوئی کہ اتنا قوتِ باریتاکہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی آپ نے بیسویں صدی کی ابتدا ہی دیکھی اور اب اکیسویں صدی کی ابتدا کی دھوم ہے آج سے ساٹھ سینسٹھ (65x60) برس پہلے لکھے ہوئے آپ کے اشعار آج کے ماحول سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں یہی سب سوچتے ہوئے میں نے سوچا کیوں میں بذریعہ خط موجودہ حالت سے آگاہ کروں۔

اب دیکھئے نا آپ کے زمانے میں مس ہو کر تھی اچھل کماری ہے آپ نے میر صاحب کو مخاطب کیا ہے اور اب شریعتی جی ہیں میر خیال ہے بات یوں نہ تھی کیوں نا آپ کے اشعار کے ساتھ بات واضح کی جائے کیا خیال ہے اکبر صاحب آپکا؟ مجھ سے متفق ہیں نا آپ؟ تو سنئے آپ ایک جگہ کہتے ہیں۔

بوئے وفا نہیں مسوں کے اصول میں — بس رنگ دیکھ لیمے گلے کے پھول میں
تو جنتاب وہ جو تیرے تھے دوائے دل وہ دوکان بڑھا گئے یعنی مسوں
کاپتہ کرتے گیا ان کی جگہ کماریاں ہیں۔ رہی بوئے وفا کی بات تو نہ جب تھی نہ اب ہے۔ کم از کم
آپ کے زمانے میں گلدانوں میں سجے کاغذی پھول خوشبو نہیں تو بدبو بھی نہ دیتے ہونگے اچھل
تو باغ پھول بھی کاغذی معلوم ہوتے ہیں مصنوعی کھاد کے استعمال نے پھول کا مزاج ہی
بدل ڈالا اب کماریاں گلوں میں نہیں بس اسٹیڈیہر دستیاب ہوتی ہیں!!

افسوس کے لباس کے متعلق بھی آپکا فرمایا ہوا کشش کھو چکا ہے۔ شلا آپ کہتے ہیں۔
سایہ موت ہوئی غبار بنا۔ پانچوں میں اور بھر ہے ہوا۔ آپ کی یہ بات بالکل
out of DATE ہے یعنی سایہ تو سرے سے خائب ہے ہوا بھر پانچوں سے نہ جانے آپکی مراد
کہلے خدا جانے یتون کی طرف اشارہ ہے یا شلوار کی طرف کیسی آپکی معلومات کے

لئے عرض ہے کہ سائے کی ہوا تو نکلی ہی تھی اب تو شلوار اور پتلون کی ہوا بھی نکل کر ٹانگوں سے چھٹ گئی یہ لباس جوان بوڑھے دونوں کے استعمال میں ہے پتلون کی تو یہ حالت ہے کہ دور سے دیکھتے تو معلوم ہو کہ دو غلاف چڑھی ہندو توں کو پاؤں لگ گئے ہیں۔ شلوار آپ کے زمانے میں پانچ گز سے کم میں کیا بنتی لیکن آج کل یہ پانچ گز میں تیار ہوتی ہے اور دیکھنے میں شرعی پاجامہ کی بدلتی ہوئی شکل ہے دیکھیں کہ اسکو مردوں کے لباس میں شامل کریں اکبر صاحب! یہ تو آج کل کی کماریاں پہنتی ہیں اور بڑی اسمارٹ لگتی ہیں شاید انکو معلوم نہیں کہ زمانہ حال میں نہ صرف لباس میں بلکہ خود مرد اور عورت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے اور گیوں نہ ہو جناب یہ برابر کا دعویٰ کچھ یوں ہی تو نہیں۔ آپ کے زمانے میں راز بھی موچھاں تھی تو سر کے بالوں سے مرد اور عورت پہچانے جاتے تھے یعنی اتنا تو تھا کہ بال پیشانی اور گردن تک نہ آ پاتے تھے آج کل خدا جھوٹ نہ بلائے تو ان دونوں نے بالوں کا اچھا خاصہ مقابلہ کر رکھا ہے۔ اور وہ دن تیار وہ دور نہیں کہ مردوں کو بھی مہاف اور بالوں کے پن کا استعمال کرنا پڑے ایسے مردوں کی قطاریں انکو سینما ہال کے ٹکٹ گھر کے سامنے نظر آئیگی آپ دیکھ پاتے تو یہی سمجھتے کہ مغل دربار کے خواجہ سرا ابھیں بدل کر شہر میں نکل پڑے ہیں!!

آپ کے وہ دو شعر بھی خوب ہیں جس میں آپ نے اپنے زمانے کی عاشقی کا نقشہ کھینچا ہے۔

لیلیٰ نے سایہ پہنا بجنوں نے کوٹ پہنا۔ ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خاموش رہنا۔۔۔۔۔

حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن۔ ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

اطلاعا عرض ہے آج کل لیلیٰ سایہ نہیں بلکہ SACK پہنتی ہے اور بجنوں نے تو کوٹ

مدتیں ہوئیں پہنا چھوڑ دیا آج کل وہ لیٹشرٹ یا بشرٹ میں نظر آئینگے واقعی آپکے لئے یہ دونوں نام نے ہیں آپ نے تو انگریزی میں بشرٹ اور اردو میں قمیض سنا ہو گا یہ ان دونوں کے درمیان کی چیز ہے یعنی آپ کے زمانے کی فیشن ایبل خواتین جو چمپیر ہستی تھیں وہ لب سامنے سے کھول کر بشرٹ بنا دیا گیا یہ پتلون کے باہر رہتا ہے غالباً پتلون کمر لیر اس قدر تنگ ہے کہ علاوہ

کمر کے مزید کسی چیز کی گنجائش نہیں رہتی وہ زمانے لڑ گئے جب ییل کی کمر کے متعلق سوچنا پڑتا تھا کہ کہاں ہے کوہر ہے لیکن اچھل حضرت جنموں کے بارے میں ہی گمان ہوتا ہے۔ حسن و جنون تو بے شک اپنی جگہ قائم ہے اور عاشق و معشوق فیشن کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں مگر کچھ جبریت ضرور پیدا کی گئی ہے مثلاً فیشن کے سمندر میں بہتے ہوئے ساحل پر نہیں بلکہ فیشن ایل ہوٹل کا رخ کرتے ہیں اور کوئی 'خوبصورت سا گیت ریڈیو پر سنستے ہیں دیکھے میں بہک گئی۔ آخر ہوتا پارانے زمانے کی! ریڈیو نہیں بلکہ ہولڈی میں جیوک باکس ہوتا ہے اب اگر اسکی تفصیل بتانے بیٹھا جاؤں تو ڈر ہے خدا کی طوالت سے آپ اکتانہ جائیں! اتنا جان لیجئے کہ یہ سائنس کا ایک کرشمہ اور کمال کا نوکھا طریقہ ہے بس 25 پیسے۔۔۔ انوہ بھی آپ کے جانے کے بعد یہ کسی تیریلماں ہوگیں اب آپ بحث کریں گے کہ یہ 25 پیسے کا کیا ٹک ہے قبلہ اچکے زمانے میں دو اور دو چار ہو کر تھے لیکن ہمارے زمانے میں تو حساب ایک ہی ایک کا ہوتا ہے اب آنے والے رخصت ہو کر سیسوں پر بات آگئی ہے "اب تو 6 آنے بات پکی" والا امارہ بھی ناقابل استعمال ہو گیا ہے ہاں تو بس اس ڈبے میں 25 پیسے ڈالئے اور پسندو کار یا کارڈ سنسے بس ہی ہمارے زمانے کے ییل مجھوں کرتے ہیں گیت کے دوران ناز غرے بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تیر نظرے گھائل ہونے کے بجائے پستول چل جاتے ہیں اور ریکارڈ چلتا ہوتا ہے آج رسوائی تیری گلیوں میں حجت ہوگی۔ دیے جیوک باکس کایشن بھی ختم ہو گیا اب ٹی وی چلا کرتا ہے ارے نہیں صاحب خدا نہ کرے ٹی وی نہیں بلکہ یہ باسکوپ کا ڈبہ ہے اور بی اے اندھیرے کے روشنی میں دیکھا جاتا ہے گھر گھر نظر نہ آئے گا اب تو جس گھر میں ٹی وی نہ ہو شرفاء میں شمار نہیں کیا جاتا شرفاء کی پہچان بدل گئی ہے۔ اب چھوڑے بھی اس بحث کو! اکبر صاحب اچکے وقتوں کے لوگ بڑے بھولے تھے بی اے یا گریجوٹ ہو جانا گویا معراج تھی لیکن ہمارے دور میں گریجوٹ بوٹ پالش کرتا ہے رکتا چلاتا ہے یا پھر بے روزگاری سے تنگ اگر خود کشی کر لیتا ہے اکثر اس آرٹ سے ناواقفیت کی بناء اقدام خود کشی کے حرم میں دھرنے جاتے ہیں دیے یہ بھی برا نہیں گو وقت ہاؤس میں کھانے ل ہی جاتا ہوگا۔!

یہ نیچے اکر صاحب کمال کر دیا آپ نے اب تک شیل اور کرسیوں کے چکر میں ہیں کسی معصومیت سے فرماتے ہیں۔

طریق مغربی سے شیل آئی گریساں آئیں۔ دلوں میں وٹولے اٹھے ہو س میں گریساں آئیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہنز اور عجمی اپنی گریساں بدل لی ہیں یعنی عجمی ہما ہنز کہلائے لگے ہیں آپ نے بھلا کا ہے کو سو جا ہو گا کہ ایک دن وہ آئے گا جب اچھے خاصے مغز لوگ ہاتھ پر روٹی دھو کر کھاتے نظر آئینگے لیکن سچ تو یہ ہے کہ انسان آسان پسند ہو تا جا رہا ہے

دعوت کا اہتمام بس اتنا کہ ایک میز بچائی اس پر کھانا چن دیا رکابیوں کا ڈھیر لگا دیا کھڑے کھڑے رکابی پکڑ لی اور کھانے میں مصروف ہو گئے طریق مغربی سے جو میز کرسیاں آئی تھیں اب اس میں گھن لگ رہا ہے بات یہ ہے لوگ اصول وصول کے قائل نہیں رہے لیکن کے فقیر صرف محاورہ رہ گیا۔ ہاں یہ جو نیا طریقہ کھانے کا ایجاد ہوا ہے اس کا نام ہے بونے آپ ہی کی طرح میں بھی سوچتی ہوں کہ بونے جیسا بد مزہ نفعاً دعوت سے کیسے جڑ گیا؟ یہ جو دلوں اور ہو س والی بات ہے نا اب اسکی اہمیت ختم ہو گئی ہے آپ لوگوں نے بلاوجہ شرافت، عزت، بہرہ و اور اسی قوم کی نزحانے کیا باتیں زبردستی اپنے پر لاد رکھی یقین ظاہر ہے جب اپنے ہاتھوں ہی آپ لوگ مجبور تھے تو دلوں اور ہو س تو سراٹھاتے ہی۔ معاف کیجئے گا آپ لوگ تھے بھی بڑے جذباتی۔ موجودہ دور جذبات کا نہیں عمل کا ہے ایک لفظ سے طغیانی

پریشانی اس دور میں اتنی کارواں ہے۔

اکبر صاحب اپنی ایک بات تو سونے میں تلنے کے لائق ہے یعنی آپ کھری کھری کہتے ہوئے بھی انداز ایسا رکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں "قبلہ میں تو مذاق کر رہا تھا" اس تمیز سے وطلب ہے کہ جب آپ صاف بات کہہ سکتے ہیں تو یعنی سچی برداشت بھی کر سکتے ہونگے گستاخی معاف یہ جو عورت کی تعلیم پر آپ نے جگہ جگہ چھوٹ کی ہے یہ کچھ اچھا نہیں کیا اپنی جنس کو دیکھنے اسکی اصلاح کرتے کیہ ہمارے راستے میں کانٹے بیٹھنے سے آپ کو کیا ملا کبھی تو آپ کہتے ہیں۔

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
 برائے مانے گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو منہ میں آیا کہہ گئے بغیر سوچے سمجھے۔ شوہر و اطفال کو آپ
 نے قوم سے الگ کر دیا کیلئے کوچہ سکتی ہوں کہ قوم کیا انڈے سے نکلتی ہے؟ انڈے سے برآمد ہوتی ہے
 تو انتہا کر دی آپ نے۔ کیا یہ تو اندھیر ہے سچ بچ اداہ جناب واہ۔ اداہ چھٹیں بی
 فاخہ اور کتے انڈے کھائیں۔ اکمال ہے آگے فرماتے ہیں۔

ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی۔ یہ نہ بتلایا کہاں رکھتی ہے روٹی رات کی
 ”یہ ان“ آخر کون ہیں آپ کو ان سے کیا مطلب۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کو اس طرح میاں
 بیوی کی گفتگو چھپ کر سنتا ہی نہ چاہیئے تھا۔ خدا جانے انہوں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے
 آپ کو تو بیان چاہیئے۔ جب چھپ کر بات سن رہے تھے تو پوری بات سنی ہوتی ممکن ہے
 اسکول کی بات ختم کر کے بیوی رات کھا یا سی روٹی کے بجائے تالاہ روٹی سانسے رکھتی۔ اسکول
 پر گفتگو کرنے والی ظاہر ہے کہ سلیقہ مند اور شوہر پرست ہی ہوگی بھلا رات کی روٹی کیوں دیتی۔
 لیکن آپ تو بس! کیا کہوں جانے دیجئے۔

اب یہی دیکھ لیئے کالج کی عمارت بھی اپنی آنکھ میں کھلتی ہے بعض لکھی ہے آپ کو بجائے
 مبارکباد دینے کے بس کہہ دیا۔

کالج بنا عمارت فخر النساء بنی — شکر خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی

ارے صاحب شکر ادا کیجئے کہ کالج کی بدولت بیٹی کے لئے ہر ادبیٹے کے لئے لڑکی
 کی تلاش کرنے کی رحمت والدین چمکے گی۔ لڑکیوں کی پسند سے شادیاں کر کے پھر صاحب ہم نے
 بہت پیار پڑیلے ہیں۔ اور یہ تو اپنی سراسر زبردستی ہے جو کہ صحیح بات کہتے ہیں۔
 حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی۔ اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی۔
 قبلہ ذرا یہ تو بتلائیے کہ عورت کب شمع انجمن نہ تھی ابی جناب وہ تو اپنی ذات
 میں انجمن اور صفات میں شمع ہے قصور انگلش کا نہیں اپنی سوچ کا ہے اور سوچ پیرا ہوتی ہے۔
 فطرت اور ماحول سے یہ ذرا یہ تو بتائیے ہرگز سے جب عورت چراغ خانہ تھی تو کونسی

قدر کی آپ نے! اسوقت شمع انجمن کی جھکتی میں بازار حسن کے چکر کون اور کیوں کڑے گئے۔ ہو گئے تالا جواب اچھو ہم جیسے واسطے ہی نہ پڑا اور نہ ساری شاعری دھری رہ جاتی۔

ایک بات پوچھوں؟ مبرا تو نہ مانے گا کیونکہ ذرا دکھتی رگ ہے انگلی پڑے گی تو دکھائی

دیے مجھے انکی طرح لوگوں کے گھروں میں جھانکے کا شوق نہیں ہے۔ اور بنی زندگی پر سوال کرنے کا حق بھی نہیں۔ مگر کیا کروں ایسی بات سنی ہے کہ یہ یقین کرنے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن عورت کے متعلق آپکے خیالات شبہ کی گنجائش غی نہیں چھوڑتے۔

بات یہ ہے اکبر صاحب ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ آپکی ہم خیال نہ تھی ان سے ایک بیٹا بھی تھا دونوں نے بڑی مہینت اٹھائی اور آپ ایسے کھڑے رہے کہ بستر مرگ پر پڑا بیٹا آپکے لئے ترستار یا اور آپ نے اسکو الوداع بھی نہ کہا کیا یہ سچ ہے اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اپنے کو آپ اور دوسرے کو تو والا معاملہ ہو گیا۔ آپ نے اپنے لئے تو آپ پر بھی لکھی بیوی چاہتے ہیں اور دوسروں کو مشورہ ہے کہ دیکھو اسکول کی لڑھی لڑکی گھر میں نہ لانا واہ کیا انصاف ہے صاحب۔ ایک طرف لڑکیوں کو علم سے دور رکھنے کی پوری کوشش اور خود معصوم سی بیوی کو نباہ بھی نہ سکے!! اکبر صاحب یہ آپکی زندگی کا بڑا تاریک پہلو ہے ہو سکتا تھا کہ جس کالج کو آپ فخر ادا کہتے ہیں اگر اسی غریب نے وہاں تعلیم پائی ہوتی تو وہ خود سوچ سمجھ کر شادی کا فیصلہ کرتی۔ آپ کی زندگی کے اس پہلو کو دیکھنے کے بعد واقعی آپکی صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔!!

اور آپ کا یہ کہنا سراسر غلط ہے

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بیوی پہلک پسندیلیدی
یہ خرابی تعلیم سے نہیں مرد سے پیدا ہوتی ہے غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہے آپکی
یہ سوچ۔!! آپ نے تو خود ہی اعتراف کر لیا کہ ظلم شروع کی تھوکتا بھی نہیں۔ اندھے
اجالے کبھی جوتکتا بھی ہیں — تو ہمیں کس منہ سے کہتے ہیں سچ اکبر صاحب آپ نے ہمیں بہت

بدنام کیلئے لیکن پھر گلہم اپنی عزت کرتے ہیں کیوں اسکا جواب آپکے یہ دو شعر ہیں۔
 بے پردہ کل ہوا میں نظر چند بیسیاں — اکبر زمین میں غیرت قوی سے گر گیا
 پوچھا جوان سے آپکا پردہ کدھر گیا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پردہ گیا

آخری مصرعہ تو غضب کا ہے آپکا سارا کلام ایک طرف اور یہ چار مصرعے ایک طرف۔
 یعنی آپ چند بیسیوں کو دیکھ کر زمین میں گر گئے۔ نہیں صاحب اس گڑ نے میں کچھ گڑ بڑ ہے۔
 یہ غیرت قوی نہیں ہے کچھ دال میں کالا ضرور ہے خیر میں اپنے منہ سے کیا کہوں ہماری صدی میں تو
 بیسیوں اور بیسیوں کے غول کے غول نظر آتے ہیں اور سب خیریت رہتی ہے آپ ہیں کہا
 چند بیسیوں کو دیکھ کر بوکھلا گئے۔ یہ غول دیکھتے تو یقینی کوئی زہر دست حادثہ ہو جانا یہ بھی
 اسکو مڑ وغیرہ کی زد میں آجاتے یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اپنے اطمینان کی خاطر لوچ ہی لیا
 کہ پردہ کدھر گیا۔ بیسیوں کا جواب تو لا جواب ہے۔ عقل پہ مردوں کی پردہ گیا یہ تو مردوں کی
 جب تاریخ لکھی جائیگی تو انکی صفات کے باب میں یہ مصرعہ سنہری حروف سے لکھا جائیگا
 میرا خیال ہے اب رخصت ہونا چاہیئے۔ امید ہے نعانے کا رنگ اپنی سمجھ میں آگیا ہوگا۔

بس یہ ہے ہمارا زمانہ اور ہمارا ماحول لکھنے کو تو بہت کچھ ہے اس دور میں بھی آپ جیسی ہستیاں
 موجود ہیں جو انکھیں چھاڑ چھاڑ کر ہماری طرف دیکھتی ہیں لیکن کچھ سمجھ نہیں پاتیں۔ نظر میں
 حیران چہرے پریشان اتنی بڑی دنیا میں اپنے کو تنہا پاتے ہیں اس حساب سے تو اچھا ہی ہوا
 اکبر صاحب کہ آپ اس دور میں مڑ رہے ورنہ قیامت کا سامنا ہوتا۔

خطا کا لہجہ بے تکلفانہ ہو گیا ہے اگر کوئی گستاخی ہو گئی تو یہ سمجھ کر درگزر کر دیجئے گا۔
 کہ آخر بیسویں صدی کی کھپ ہے اور اکیسویں کے دباے پر کھڑی ہے اس سے اور اسید بھی
 کیا رکھتے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو سلام پہنچائیئے جواب سے تو مایوس ہے لیکن شاید روز
 حشر بالمشافہ گفتگو کا موقع مل جائے۔ خدا حافظ۔



شاعر کے خواب اور تصورات

عرف عام میں شاعر کی تعریف کچھ یوں ہے کہ شاعر اس کو کہتے ہیں جو شعور کے لیکن ہر
 ناچر نے یہ ہے کہ جن و بشر کے درمیان بھی ایک مخلوق ہے جسکو شاعر کہتے ہیں !
 آپ کوئی جھٹکرنے پر ہی تل جانے کے صاحب کسی آسمانی کتاب میں ایسی
 مخلوق کا ذکر نہیں ہے۔ آخر آپ کس بنا پر اس کو مخلوق جانا تو میں دست بستر عرض
 کر رہی گی کہ قبلہ اجماع اللہ پاک نے کائنات کی بہت چیزوں کو پوشیدہ رکھا ہے
 ہو سکتا ہے کہ ”مخلوق شاعر“ کا ذکر بھی مصلحتاً نہ کیا ہو اور یہ بھی کوئی راز ہو !
 جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا تعلق ہے بھلا ان کے انسان ہونے سے کس
 کو انکار ہو سکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ فطرت اور مزاج معاذ اللہ! یہی وہ مقام
 ہے جہاں سے حضرت شاعر جن و بشر کی درمیانی بخیل نظر آتے ہیں۔ مزاج کا تو یہ عالم
 ہے کہ ذرا میں تو لہ ذرا میں ماشہ۔۔۔۔۔ کسی کل قرار نہیں کسی بات میں اعتدال نہیں
 تعریف کرنے پر آئیں تو زمین و آسمان کے قلاب ملا دیں پھر پرائر آئیں تو سارا دنیا
 پر ٹھکرا دیں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ان کا دخل نہ ہو۔ رہا فن موسیٰ شاعر
 خود کہتا ہے کہ ”ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں سما“ عاقل کا کیا کہنا یہ تو ان کا اور
 کچھونا ٹھیکر غرض انکی دنیا خواب و خیال کی دنیا ہے اور اس دنیا میں جو کچھ ہے تصور
 ہے۔ یہ تصورات کی بنیاد پر ایسے ایسے محل تعمیر کرتے ہیں کہ انگشت بردن
 رہ جائیے خواب کون نہیں دیکھتا ہوائی قلعے بھی لوگ تعمیر کر ہی لیتے ہیں لیکن
 شاعر کا کیا مقابلہ یہ تو تصورات کو الفاظ کا کچھ ایسا جامہ پہناتا ہے۔ جو کبھی آپ کے
 حاشیہ خیال میں نہ آیا ہوگا۔ دور کیوں جائیے حکیم مومن خان مومن ہی کو لیجئے

جی ہاں وہی مومن خاں جو آخری عمر میں مسلمان ہوئے ہوتے رہ گئے اور محض اتنی
 سی بات پر کہ ساری عمر بت پرستی کرتے رہے مسلمان ہونے میں سمجھ
 فائدہ نہ دیکھا بات یہ ہے کہ مومن صاحب حکیم ہی نہیں بخوبی بھی تھے حکمت سے صحت
 کا حال اور نجوم سے عمر کا حساب لگایا ہوگا جب ہی تو مسلمان ہونے کا خیال ترک
 کر دیا ورنہ اگر کچھ اور عمر کتنا ہوتی تو بس سمجھے مسلمان ہو ہی گئے تھے! دیکھنے میں
 کوئی نئی بات نہیں بتا رہی ہوں یہ راز خود مومن خاں بتا گئے ہیں آپ بھی سن لیجئے
 تاکہ مجھ پر کوئی الزام نہ رہے کہتے ہیں ے

”عمر تو ساری کئی عشقِ بتاں میں مومنؑ، آخری وقت میں کیا خاکِ سلاہیگے“

حضرت مومن بھی آخر عالمِ خواب و خیال کے باہی ہیں سپیدھی اور صاف بات بھلا کا
 ہے کو کرتے جو بات ہے ایک معرے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا خیر صرف معرے ہی ہوتا تو
 صبر آجاتا بیٹھے حل کیا کرتے لیکن یہ شاعر تو مجموعہ افراد ہوتے ہیں انکی کسی بات
 کا ٹھکانا نہیں خود ہی ایک خیال پیش گوہر کے تائید کرینگے اور دوسرے ہی لیجئے،
 ترویج فرمادیں گے۔ ان کی کس بات کو مانیں کس بات کو نہ مانیں یہ فیصلہ کرنا
 ہی مشکل ہے زرا یہ معرہ کا شعر ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں ے

تھے بے گناہ جراثیمِ پالوس تھی ضرور

کیا کرتے وہمِ خجلتِ جلاؤ آگیا

یہ بھی کوئی بات ہوئی نا معرہ والی بات باہر ارے صاحب جب آپ بے گناہ تھے تو
 جلاؤ صاحب کیوں نازل ہوئے؟ اند کس قدم چومنے کی ضرورت پیش آئی
 اور پھر یہ ”وہم“ کیا بات ہوئی بھئی ہم تو ایک ہی ”وہم“ سمجھتے ہیں جس کے متعلق
 کہا جاتا ہے کہ اس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ گویا حکیم صاحب نے الفاظ
 کا معجون مرکب تیار کیا ہے اس کی تاثیر بعد استعمال ہی ظاہر ہوگی ہماری سمجھ
 میں تو اتنا ہی آتا ہے کہ محبوب صاحب جلاؤ کے بھیس میں میاں عاشق کو قتل

کمرنا چاہتے تھے اور عاشق صاحب کو قتل ہونا گوارہ نہ تھا انھوں نے سوچا چلو جلاؤ کہ
 پاؤں جو ہم کر کم از کم گستاخی ہی کر لو تا کہ دل کو یہ تسلی رہے کہ بے گناہ قتل نہیں ہوئے اور
 اگر جلاؤ سے باز پرس ہو تو وہ بھی صفائی پیش کر سکے کہ اس نے گستاخی کے جرم میں
 قتل کیا ہے ورنہ سچ پوچھئے تو ہم نے کبھی اس قسم کی انوکھی واردات ہی نہیں سنی!
 اب ذرا یہ ادا ملاحظہ فرمائیے۔

فرماتے ہیں ۵ کس صنم سے چھڑا دیا واعظ
 لے خدا تجھ سے انتقام میرا

صرف باتیں ہمارے ہیں ورنہ ان کو دیکھئے اور صنم کو چھوڑنا دیکھئے۔ کھسیلائے ہوئے
 معلوم ہوتے ہیں! صرف صنم ہی نے چھوڑ دیا ہو گا کسی پرس نہ چلا تو لگے گود پھیلا
 پھیلا کر واعظ کو کھسے! اہ کہ جیسا واعظ نے میرا خرابہ کیا خدا اس کے آگے لائے
 ظاہر ہے کہ واعظ کی ساری عبادت کا حاصل حویں ہی تو ہیں! اکون جانے
 کہاں تک اس خیال میں صداقت ہے ورنہ سچ تو یہ کہ شاعر کی باتیں تمام خواب
 و خیال کے قصبے ہیں۔ ورنہ کہاں کا صنم اور کیسا واعظ جو جی میں آیا فرض کر لیا اور لگے
 داویلا کرنے!

کہ صر شاعری اور کہ صر نجوم مگر تو سن خاں نجوم کو بھی یوں کھینچ لائے جیسے یہ
 بھی شاعری کا لوازمہ ہوا کہتے ہیں:

ان نصیبوں پر کیا اختصار شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا؟

نجوم کو ذریعہ معاش بناتے تو چین کی مٹی بجاتے! لیکن شاعر تو اپنے تخیلات
 کے ہاتھوں تباہ ہے جس طرح ان کے یہاں واعظ، ناصح، رقیب، اور محبوب
 وغیرہ خیالی ستم گر ہیں اسی طرح ان کو یہ بھی خیال ہے کہ خواہ آسمان سے کتنی ہی
 رحمتیں نازل ہوں، ان کے حق میں وہ ستم ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اب اس خیال کو الٹے

دل سے کون نکال سکتا ہے کوئی حضرت مومن سے ذرا یہ پوچھے کہ جب آپ کا نجوم
ہی اس کی پیدائشی کی گواہی دے رہا ہے تو بلاوجہ غریب آسمان کو کیوں بیچ میں لاتے
ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ بچے کو کون ایک جگہ فرماتے ہیں:

تم میرے پاس ہوتے ہو گھویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

خدا جانے کس نیکی کی جون میں تھے کہ ایسا صاف شعر کہہ دیا۔ اگر کسی نے اردو کی دو
چار کتابیں پڑھیں اور جاموسی نادولوں کا مطالعہ کر لیا تو سمجھے کہ بیڑا پار ہے۔ اگر
آپ اس سے اس شعر کا مطلب پوچھیں تو وہ فوراً تشریح کریگا کہ حضرت مومن
نے گویا کا لفظ عادتاً لکھ دیا ہے، کیوں کہ یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ درنہ شاعر اپنے
ایک مخلص دوست سے کہتا ہے کہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ جب میں تنہا ہوتا
ہوں یعنی گھروالے باہر چلے جاتے ہیں تو آپ میری تنہائی دور کرنے کیلئے آتے تھے ہیں۔

یوں تو مومن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کی بحث بے کار ہے ظاہر ہے کہ کوئی خواب
بیان کیا ہوگا، یا تصویریں محبوب کو قریب پایا ہوگا ورنہ اگر سچا عشق ہوتا تو عاشق
ہرگز یہ نہ کہتا کہ ”صاحب میں ایسا نکما عاشق تو ہوں نہیں کہ بس سارے کا دوبار کو
ایک طرف کر کے آپ کے وصال میں رہوں۔ آخر مجھے بھی دوسرے کام ہیں بلنا چلتا
بھی چلتا ہی رہتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب دوسرے مشاغل سے فرصت پاتا
ہوں اور آپ کا دھیان آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میرے قریب ہی موجود
ہیں“ ذرا غور کیجئے۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا، ”کہہ کر محبوب کی کس قدر ہنس
کی ہے۔ بہر حال ہم کو ان معاملات سے کیا غرض اب حضرت مومن کا ایک
شعر درپیش ضرور لگی ذرا توجہ سے سینے فرماتے ہیں۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کس خوابِ عدم میں شبِ ہیراں ہو گئے

خدا جانے مومن خاں کے تصور میں کیلئے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مخیاط کون ہے نہ
 ہی خواب عدم کی بات کھلتی ہے پھر ہم جیسے لوگ جو مادی چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں بھلا
 ان کا شعر کیا پڑے گا ہماری سمجھ میں جو بات آئی اس کا خلاصہ بیان کرتی ہوں۔
 ہوا یہ کہ مومن مرض موت ٹلے گا ہو گئے جینے کی آس نہ رہی سو نے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آپ
 نجومی بھی تھے اختر شماری سے یہ اندازہ کریا کہ کل یعنی آنے والا کل زندگی کا آخری
 دن ہے۔ طبیعت دور اندیش پانی تھی خیال آیا کہ میسر بعدہ بواشب ہجرال "کا کیا
 ہو گا ساری عمر تو میری خدمت میں گزار دی اور بڑی وفاداری سے میرا ساتھ دیا۔ اس
 کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے بس یہ خیال آتے ہی بوا کو سلتے بلا کر اس کا صاحب
 کتاب بے باقی کیا ہاتھ پر تنخواہ دہری اور نہایت مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ دیا
 کہ وہ کوئی گھر دیکھ لے تاکہ گزر بسر کے لئے بعد میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔
 اب اگر اصل مطلب پر آئیے تو وہی خواب و خیال والی بات ہو جائے گی، کیوں کہ
 ظاہر ہے کہ "شب ہجرال" انسان تو کیا کسی مادی شکل میں بھی موجود نہیں اس کے
 لئے "ٹھکانے" کا مشورہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں لیکن بہر حال یہ شاعر
 اپنی دنیا کی بات کرتے ہیں اگر ہم ان کی زبان نہ سمجھیں تو بھی پڑے شاعر کا کیا قصور!
 یہ تو تھے حضرت مومن اب ذرا چچا غالب سے ملاقات کیجئے۔ یہ دونوں
 ہم عصر تھے ایک آب دہوا سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے اس لئے خواب و خیال کی بلندی
 میں غضب کی یکسانیت ہے وہی معہ وہی پہلیاں یہاں بھی موجود ہیں مزاج کا
 وہی عالم ہے۔ خود داری پر اتر آئیں تو دنیا ٹھوکر میں آجائے بے اختیار ہوں تو
 ایسے جیسے لفظ "خمیر" ان کی لغت میں کبھی تھا ہی نہیں یا تو بے سنگڑ بنانے میں بھی
 اپنی مثال آپ ہیں ان کی روز مرہ زندگی اور اشعار کے مزاج میں زمین و آسمان
 کا فرق ہے۔ غالب صاحب کے اشعار کچھ شرط بھی چاہتے ہیں۔ مثلاً جب آپ
 شوگر میں تو وہ کیفیت بھی اپنے پر طاری کیجئے جو چچا جان بیان فرماتے ہیں جہاں

تک ہماری معلومات کا تعلق ہے چچا جان پر کبھی وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی جو اکثر وہ بیشتر ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے مثلاً اس شعر کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

کہتے ہیں :- کوئی میر دل سے پوچھے تیرے تیرنیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ غالب کے اجاد فن سپہ گری کے ماہر تھے لیکن جہاں تک مرزا صاحب کا تعلق ہے تیر تو چھوڑیے شاید سوئی بھی نہ چھوئی ہو اور بات اتنی بڑی کہہ دی میرا خیال یہ ہے کہ اتفاق سے انگلی میں پھانس لگ گئی ہوگی اور جب تک نہ نکلی کھٹک ہوتی رہی چہرہ تصور کی پرواز دیکھئے کہ ذرا سی پھانس نے تیرنیم کش کی شکل اختیار کر لی اور اُس نے جگر میں خلش پیدا کر دی ورنہ آپ ہی انصاف سے کہیئے کہ جگر میں تیر بیوی سرت ہونے کے بعد کیا زخمی کو موت اتنی مہلت دیتی کہ وہ خلش سے لطف اندوز ہوتا؟ دیکھیے خدا نہ کرے میری منتیں گسفی کی نہیں بھلا میں اور ادب سے مذاق تو بہ! میں تو صرف ان تجذبات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں جو شاعر کو رائی کا پہاڑ بنانے پر مجبور کر دیتے ہیں بشاعر خراب نہ دیکھے تو زندگی کا مقصد ہی کیا رہ جائے۔ یہ شعر سینے ارشاد ہوا ہے :

میں اور بزم نے سے یوں تشنہ کام آؤں

جگر میں زخمی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا

محمود صاحب ساقی کے ساتھ خسرے فرما رہے ہیں۔ یہ اتنا نہ بنتے تو اچھا تھا! یہ مخانہ وہ بھی اس شان کا کہ جس میں ساقی بھی ہو۔ پھر ایران کی بات ہندوستان میں اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے بزم نے کا اہتمام خاص ہند کی چیز ہو۔ اس پر اتنا دیکھے ان سے کوئی پوچھے کہ بھلے آدمی جب تو بہ کر چکے تھے تو میخانہ گئے ہی کیوں تھے محض تھے تو ہنس بول کر آجاتے یہ کیا زبردستی ہے کہ آپ تو بہ کریں اور ساقی، اصرار کرے کہ آپ کو ہماری جان کی قسم آج تو یہی ہی پڑے گی بھلا قرض کی

پینے والے میخانے میں کاہے کو گئے ہو چکے لیکن وہی مثل ہوئی کہ جہنم سب سے بُرے اور
سپنے آئی کھاٹ! نہ جانے زندگی میں کتنی بار پتہ بتانے کی نوبت آئی ہوگی لیکن
ذرا غالب صاحب کو دیکھئے کس انداز سے پتہ بتا رہے ہیں کہتے ہیں:

نوبت مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی پنخیر بھی تھا

اچھی خاصی پہلی ہے پتہ بتاتے وقت قاعدہ تو یہ ہے کہ لوگ گلی یا سڑک کا نام اور
پھر مکان نمبر وغیرہ بتاتے ہیں آپ کو دیکھئے فتراک اور پنخیر کی بات شروع کر دی
اب ان کے تصورات کو کوئی کہاں تک ٹوٹے اس کا مطلب غالب صاحب
سمجھیں یا پھر ان کا خدا ورنہ ہو سکتا ہے کہ گھر کا پتہ نہ پوچھا ہو بلکہ یہ پوچھا ہو کہ حضرت
آپ کی تعریف!! اور تعریف میں حضرت نے دست بستہ عرض کی کہ خاک تو وہی
ہے جس پر آپ نے تیرا انداز کی مشق فرمائی تھی یہ کہنا مشکل ہے کہ گفتگو کس
کے درمیان... ہوئی تھی۔ قیاس کہتا ہے کہ عاشق و معشوق ہی ہو چکے مختلف
حضرات نے مرزا غالب کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں جہاں تک خودداری اور
نفاست پسندی کا تعلق ہے سب کا یہ ہی خیال ہے کہ یہ خوبیاں عزم میں بدرجہ اتم
موجود تھیں۔ غالب صاحب کا قول تھا کہ جان جائے پر آن نہ جائے اس خیال
کو شعر میں کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود میں ہیں کہ ہم
الے پھر آئے در کعبہ اگر روانہ ہوا

جو کچھ آپ فرماتے ہیں بجا ہے کیونکہ ایک مرتبہ آپ ملازمت چھوڑ سکول گئے
اور جب وہاں کا پرنسپل آپ کی پالکی تک استقبال کو نہ آیا تو آپ یہ کہہ کر
الے پھر آئے کہ ”ایسی نوکری کو دور سے سلام جس میں بزرگوں کے اعزاز کو بھی
گنوا بیٹھوں! چنانچہ حضرت غالب کی بندگی میں بھی ایک آن باقی ہے حج کی نیت

سے گئے مگر کعبہ بنو ملا تو اتنا گوارہ نہ کیا کنڑی کھٹکٹا دیتے بلکہ بغیر فرض ادا کئے پلٹ آئے
گستاخی سچا آپ کی نیت ہی صادق نہ ہوگی جو در کعبہ خود بخود نہ کھلا خیر یہ آپ
کا ذاتی معاملہ ہے اس میں ہم کو دخل دینے کا کیا حق مابین اتنا ضرور ہے کہ جناب کے
اشعار سے خود داری کا بھوم ہر صورت کھل جاتا ہے یا تو خود داری کا یہ عالم کہ کعبہ سے
پلٹ آئے یا جو بے اختیار ہوئے تو عجیب حرکت کمر بیٹھے خیر ایسی حرکت کی بھی تو
خاموش رہتے۔ جی نہیں بڑے فخر سے فرماتے ہیں:

دھوتا ہوں جب میں سینے کو اس میمن تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے تھینچ باہر نگوں کے پاؤں

بھلا بتلائیے انتہا ہو گئی خدا نخواستہ کہیں ”میمن تن“ پاؤں سے کوئی بیجا حرکت کر
بیٹھتا تو کیسی بے عزتی ہوتی۔ افسوس نہ خود داری رہی نہ نفاست سب شاعری کی
بھینٹ چڑھ گئی۔ پھر بھی دل کو یہ تسلی ہے کہ یہ خواب و خیال کے باسی ہیں ان کے
لئے سب جائز ہے۔

غریب شاعر کی جان کو سیکڑوں روگ ملیں اس کے باوجود اپنی دنیا سے
باہر نہیں آتے رقابت اندیشہ رشک اور حسد یہ ایسی بلائیں ہیں جو ان کی جان
کو جو تک کی طرح لپیٹی ہوئی ہیں مثلاً کہتے ہیں:

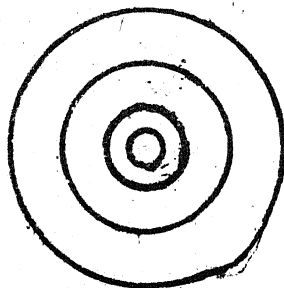
رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

خود ہی پسلی بھی اور بو تھی جب ہر بات فرض کر لی تو اب آتش رشک میں سگ
رہے ہیں۔ اگرچہ پیران کا خیال واضح ہو جاتا تو ضرور دلجوئی کی کوشش کریں مگر
یہاں تو لفظ ”دیو“ کے چکر میں آ گئے۔ غالباً غالب صاحب یہ دعا کر رہے ہیں
کہ محبوب شراب پی کر ان کے گھر آئے لیکن ”پیر نہ کرے خدا کہ یوں“ کی
بات پلے نہیں پڑتی دونوں میں سے ایک بات ہے یا تو یہ کہ شراب پی کر نہ آئے

دوسری بات یہ کہ پی کر آئے لیکن رقیب ساتھ نہ ہو دیکھتے تو شاعر کس قدر خود غرض ہے آپ ہی سوچئے کہ شراب پی کر تنہا گھر سے نکلنا کس قدر خطرناک حرکت ہے۔ مستی کے عالم میں راستہ بھٹک جائے یا خدا نہ کرے کوئی حادثہ پیش آجائے تو کس قدر پریشانی ہو ظاہر ہے ایسی صورت میں با وفا ملازم تنہا کیوں نکلنے دینگا ضرور ساتھ ہو جائے گا لیکن حضرت شاعر اپنی رقابت کو کیا کریں کہ ادنیٰ ملازم پر بھی رقیب ہی کا گھمان ہوتا ہے۔ اب غالب صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ محبوب بغیر پیئے آئے تو ان سے کھل نہ سکے گا اور اگر پی کر آئے تو رقیب ضرور ساتھ ہوگا دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ لیکن جناب یہ ہماری آپ کی دینا تو ہے نہیں۔ یہ تو شاعر کی دنیا ہے وہاں کے آداب عاشقانہ کو ہم کیا سمجھیں! اور اہل خانہ کی بات تو یہ ہے کہ خود شاعر بھی کبھی کبھی اپنی ہی سہمی نہیں پاتا خود غالب صاحب بھی اس بات کا اظہار فرماتے ہیں کہ چورٹ پر بھر چکے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ کچھ خدا کرے کوئی!

یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی التجاسن لی۔ اگر غالب صاحب ہمارے درمیان ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور چچا جان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آپ کا جو جی چاہے کہتے رہیں ہم کچھ نہیں سمجھتے! (شکر یہ ہے۔ آئی۔ آر حیدر آباد)



سوکن

ہمیں صاحبِ انا ممکن اور قطعاً ناممکن! ہمارے انکی نہ کبھی بخیر نہ بے گئی یہ جھگڑا تو زندگی کے ساتھ ہے اگر ختم ہونے والا ہوتا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔ ارمان رہ گیا کہ کبھی ہم سے سیدھے منہ بات کر لی ہوتی یا کم از کم ہماری طرف پیار سے دیکھ ہی لیا ہوتا وہاں تو یہ حال ہے کہ جب دیکھو منہ پھلائے روٹھی کھڑی ہیں۔ اگر کان میں بھٹک بھی پڑ جائے کہ ہم نے میاں سے ساتھ کہیں جانے کا ارادہ کیا ہے تو پھر دیکھئے ہمارا رخ میں رکاوٹیں ڈالنے کے کیسے کیسے ڈھنگ اختیار کئے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم ہر ایک کو دل میں بٹھاتی ہیں سستی ستائی نہیں اپنی آنکھوں سے ان کا پیار دیکھا ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ بھکو دکھا دکھا کر پیار کیا جاتا ہے گویا بھکو جلانے کے سلمان کئے جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہیں ہم سامنے آجائیں تو پھر تماشا دیکھئے کلیجے میں ایسی آگ لگتی ہے کہ منہ سے دھواں اگلنے لگتی ہیں۔ جہاں کھڑی ہونگی چپک کر رہ جائیگی کیا مجال جو ایک قدم بھی ہماری طرف بڑھ جائیں اگر کوئی صلح صفائی کی کوشش کرے تو ایسا تماچہ رسید کریں کہ چٹھی کا دودھ یاد آجائے ان کے نخرے خدا کی پناہ!

یوں تو ہمارے شوہر نامعلوم ایک نہیں کسی لائے اور لائے ہی رہتے ہیں ارے صاحب یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے یعنی کہ ~~ہمارا~~ ہائی ہے اب یہ کلا ہی بیکار رہے کہ وہ کیوں لاتے ہیں اور پھر انکی اس ~~ہمارا~~ سے ہمیں کبھی تکلیف بھی تو نہیں پہونچی ان آنے والیوں میں ایک سے ایک حسین بھی رہیں۔ جوان، ادھیڑ اور بوڑھی بھی شامل ہیں۔ غرض ان آنے والیوں میں ہر قسم اور ہر ذات کی آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ انکے دنیا کے بھر کے چاؤ جو بچلے ہوئے مگر کیا مجال کہ ہم سے بچوں بھی نہ ہو لہذا ہم اپنی جگہ مگن رہے۔ اور اب جو یہ بسورتی صورت آئی

ہیں تو اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن ان کا بھی یوریا نیٹر سمٹ ہی جائیگا مگر کب یہ اللہ بہتر جانتا ہے!! غرض پہلی والیوں نے جیسا جی خوش رکھا یہ کمبخت توڑنا بت ہوئی اور غضب یہ ہوا کہ میاں کو جو حسن اس میں نظر آیا وہ پہلے کسی میں نظر نہ آیا تھا۔ نگوڑی کی کچھ شکل بھی اُسے تھے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رنگ و روغن تک ٹھکانے کا تھیں صورت یہ جیسے چمکا برس رہی ہو۔ آئے دن کی مریض ہر وقت کی رنگ رنگ کبھی آواز بیٹھ گئی تو کبھی کان پیٹ ہو گئے۔ آگ لگے پیٹ کو جہنم کی آگ کسی طرح بجھتی ہی نہیں بس کھلے جاتی ہے دوا دارہ میں میاں کا دوا لے پڑا جاتا ہے دیکھنے والے اندہ ہی اندہ اس تنہا ہی پر کڑھتے ہیں مگر ہر حال عشق تو اندھا ہوتا ہے میں تو کہتی ہوں کڑھتا ہی بریکار ہے۔ میاں کا عشق بھی چلتا پھرتا ہے کبھی نہ کبھی یہ بھی چلتی پھرتی نظر آئیگی قوی اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اپنا بچ ہو گھر بیٹھ ہی رہینگے۔

اُسے ہے تو یہ ہے میری تمہید میں ایسی گم ہوئی کہ یہ بتانا ہی یاد نہ رہا کہ آخر اشارہ کس طرف ہے تو یہ تو یہ میرے میاں کے متعلق کوئی ایسا ویسا خیال بھی دل میں نہ لایا گیا۔ ”ہمارے میاں ایک نہیں کئی لاپکے ہیں“ تو کیا خدا خواستہ آپ سمجھ رہے ہیں ”بیویاں“ جی نہیں جناب عرض ہے کہ موٹر یعنی کار۔! بھکو تو گنتی یاد نہیں دیکھنے والوں کا کہتا ہے کہ ہم سال میں چار قسم کی موٹروں میں نظر آتے ہیں۔ نئی سے نئی کھڑا اسے کھڑا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی۔

ایک مرتبہ ایک لمبی چوڑی موٹر آئی دل میں خوب خوب منصوبے باندھے کہ اس میں کسی طرح بیٹھیں اور کس ادا سے انہیں آئیں۔ لیکن اس میں بیٹھ کر اترانے اور اگڑنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ہوا یوں کہ بڑی تیاری کے ساتھ اس میں بیٹھ کر عابد روڈ گئے اور اسی دن شام کو ہم نے ایک عزم سے سنا کہ ”صبح آپ کی موٹر نظر آئی تھی مگر آپ اس میں نہیں بیٹھیں“ آپ یہ غضب آپس میں تو کیا ہے ”چھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں گان“ ایسی موٹر کہ بڑی کو

لے کر کیا کریں جسیں ہماری ہنستی ہی گم ہو کر رہ جائے۔ اس موٹر کا نام میں نے گھیسٹ رکھا تھا۔ اس کے بعد جو موٹر آئی اس کے متعلق اتنا ہی کہہ دیا کافی ہے کہ اس میں ہم لوگ بیٹھتے نہیں تھے بلکہ ٹھونسے جاتے تھے۔ پھر ایک ایسی موٹر آئی جو کوسرے سے موٹر کہتا ہی رہی ادنیٰ تھی کیونکہ یہ غالباً اللہ کے نام اور دو طبیبوں کے نہ ولس پر چلتی رہی ایک دن باغ غم کے قریب اسکا پیہیہ اس زور سے نکل کھٹکا کہ آج تک پتہ نہ چلا کہ کدھر کو گیا۔ خدا جانتے میاں کی کوئی نیکی کام آئی کہ موٹر قٹ پاتھا ہے لگ بھگ گڑگڑ گئی ڈیر سو روپے میں دھکی کھڑے کھڑے ہر راج کر کے گھر تشریف لے آئے۔ یہ ساری موٹریں میچا ریاں خواب و خیال ہو چکی ہیں اب ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن انکی یادیں باقی ہیں اب جو ہمارے پاس موٹر صاحبہ ہیں انکی ادائیگی دنیا سے نرالی ہیں میرے ساتھ تو وہ سوکنا یہ ہے کہ خدا کی پناہ اپنی مرضی چلانے پر تلی بہتی ہیں ان کی مرضی کے خلاف کون کئی جگہ سے ہلا دے تو ہم جانیں۔ !

اچھی خامی عمر ہے مگر نخرے چھو کر یوں جیسے ہی وہ تو کہنے ان کا جنم ولایت کا ہے کہ اتنی چل گئیں ورنہ نہ جلتے کب کی کسی کیاڑی کی دوکان میں ڈھیر نظر آتیں۔ انکو چلتے پر آمادہ کرنے کے لئے بڑے دل گر دے کی ضرورت ہے اور اگر اتفاق سے چل پڑیں تو پھر دیکھ چلتے کا وہ ہنگامہ خیز انداز ہے کہ کچھ تو پوچھئے اٹھلا کر ان کا قدم اٹھانا بھی غضب ہے چند قدم چلتے پر سارا کھایا پیا ہضم ہو کر بھوک پلٹ آتی ہے اور کبھی کبھی تو یہ اٹھلاتی چال معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کے سارے سارے سامان کو دیوائی ہانڈی میں تبدیل کر کے رکھ دیگی پھر چال تو جیسی کچھ ہے ہنگامہ وہ غضب کا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے کچھ ایسا ٹٹکے کی چوٹ جیتی ہیں کہ میلوں آگے سے لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے اور راستے سے ہٹنے لگتے ہیں گویا باران کا کام بھی نکلا دینا ہے آوازیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں غرضی چہرہ جوں سے کہ ڈھیر بڑھ کر سب ہی شامل ہیں۔ بیٹھے والے کو یہ گمان رہتا ہے کہ وہ موٹر پر نہیں آئے زور پر سواہ ہے اس میں بیٹھ کر ساتھ سے بات کرتے کی کو شمشیں کسنا ہے سواہ ہے منہ سے کچھ نکلتا ہے سنائی دیتا ہے اس میں تو سب

اس طرح اچھلتے کودتے چلتے ہیں گویا بچے کے ہاتھ میں گتیندا لچل رہی ہو پھر اچھل کود بھی
دقتی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب ساکت ہو جائے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا تھا کہ ان کی موٹر کی ہر چیز بجتی ہے سوائے ہارن کے
اس معاملے میں ہماری موٹر دو جوتے آگے ہی ہے کیونکہ جہاں اس کی ہر چیز بجتی ہے وہیں اگر
غلطی سے ہارن پر ہاتھ پڑ جائے تو بلیس فیامت ہے معلوم ہوتا ہے سور پھونکا جا رہا ہے
ہارن بند ہوئے کا نام ہی نہیں لیتا تا وقتیکہ گاڑی روک کر اس کی کانکوشی نہ کی جائے۔ بہر حال
سوکن کو دیکھ کہ خدا کی شان نظر آتی ہے ترچی نظروں کی کیا تعریف کیجئے جب لائٹ کھول دے
سڑکوں سے گزروں اوچی کھی درختوں پر اور کبھی عمارتوں کی کیمپاؤنڈ وال پر پڑ رہی ہے کیا
مجال جو سڑک پر کچھ نظر آجائے چلانے والے کو تو بہر صورت ٹنٹول ٹنٹول کر ہی چلانا پڑتا
ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ چولہے کے پولیس والے کی تشفی کی خاطر لائٹ کھول دی جاتی ہے۔

دل کی حالت بھی ایسی خاص اطمینان بخش تھیں ڈاکٹر تو علاج کر کے ہار چکے تھے مگر ایک
دن ہمارے صاحبزادے نے غور و فکر کے بعد علاج دریافت ہی کر لیا آخر کس باپ کے
بیٹے ہیں دلاریہ عجیب و غریب علاج بھی ملاحظہ ہو کہ اب یہ ہوتا ہے کہ جہاں چلتے چلتے دھڑکنی
رکتی محسوس ہوں اور قولا ہی سیدھے ہاتھ کا دیروانہ کھولا اور پوری قوت سے ڈھڑ سے
بند کیا لیجئے اکھڑی سانسیں پھر ہوار ہو گئیں۔ ثقاہت کا یہ عالم ہے کہ توبہ بھلی پیروں میں دم
نہیں چال ٹھیری چھبیلی رستہ دیکھیں تہ گھر جنگل دیکھیں تہ گاؤں جہاں جی چاہا اکڑ کر کھڑی ہو گئیں
معلوم یہ ہوا کہ پہلے کی ہوا اکل گئی اب بیٹھے سر پر کھڑے آئیں ایسی چھڑے چھاٹ کے ساتھ کوئی
سلمان بھی نہیں خالتو اسٹفی بھی غائب ہیں جینک تدار کہ پیہہ نکال کر ہی درست کر لیا جاتا۔
غرض دنیا کی مصیبت جھیلنا پڑتی ہے نظروں سے اوجھل کرنا میاں کے بس کی بات نہیں۔

کہتے ہیں اس میں ایک عدد ڈگ بھی ہے جو صدا بند دیکھی ایک مرتبہ ریل کا سفر دل پیش تھا۔
بیشکل تمام ڈگ میں سامان لے کر اسٹیشن پہنچے یقیناً سامنے ڈگ کھولنے میں ایسے نگے کہ ٹرین

سانے سے نکل گئی۔ جو سوکنا پیدل نے میرے ساتھ روانہ کیا کسی نے نہ رکھا تھا۔ میاں کی تو ظاہر ہے کہ نور نظر ٹھہری مگر مجھ سے خدا جلنے کہلا کا بیر ہے۔ اگر دل میں بھی میاں کے ساتھ موٹر میں بیٹھنے کا ارادہ کر لوں تو میرے ارادہ کا خمیازہ ہے چارے میاں کو پیدل دفتر تک جھکتا پڑتا ہے مگر کو وقت تو یہی ہے کہ اس دشمنی کو جواب ڈھکی چھپی بھی نہیں رہی شوہر نامدار اتفاق کہتے ہیں مجھے تو بس ڈب ہی لگا رہتا ہے کل ہی کی تو بات ہے مجبور کر کے موٹر میں بٹھایا ہوا کہما کہ صاحب آپ کی موٹر سے ہمارے ستارے نہیں ملتے کیوں جان جو کھوں میں ڈالتے ہو مگر وہاں سنا کون ہے بولے ”بھئی ہترین چل رہی ہے ابھی تو بچوں کو اسکول پہنچا کر آیا ہوں اتنی جلدی کیا تراب ہوگی“ خیر صاحب ہم یا تو بیٹھ گئے اب جو سلف دباتے ہیں تو ایک فٹ کی آواز نکلی اور سنا ہوا گیا ہال پر ہاتھ رکھا تو وہ بھی دبی سی آواز نکال کر خاموش ہو گیا کہنے لگے ”بھئی بیٹری ڈاؤن ہو گئی“ میں نے کہا حیران یہ ہمارے قدموں کی برکت ہے آپ بیٹری لیے پھرتے ہیں میں کہتی ہوں تروسی بیرک داؤن نہ ہو جائے“ غرض سڑک کے چند چھوڑوں اور گھر کے ملازمین کی مدد سے ڈھکیل کر بمشکل تمام اسٹارٹ ہوئی مجھے تھوڑی ہی دور پر تو جانا ہی تھا ابھی گیٹ میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ اسٹرونگ آگیا میاں کے ہاتھ میں ایسا گویا سوکن بالکل ہی بے لکام ہو گئیں مجبوراً جہاں پہنچے تھے موٹر چھوڑ دیا مکان کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ میں نے دبی تراباں سے پوچھا کیا اس کو بھی اتفاق کہو گے ”اس نے تو ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ اگر وقت اجازت دیتا تو دفتر لکھ ڈالتی جب ستارے پر انتر آتی ہے تو کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ میاں کے دوستوں اور بیویوں کے ساتھ پکنک کا پروگرام بتا کر بتا کر دیا کہ تہہ کرتا۔ دو چار کو اس موٹر میں بھی بٹھانا ہی چاہا اللہ اللہ کر کے کار روانہ ہوئی راستے بھر دعا کرتی رہی کہ اللہ میاں لاج رکھ لیجو مگر کہاں شنوائی ہوتی دعا کے الفاظ پورے ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ پٹرول پمپ پر پٹرول لینے کے تو دہائی کے ہو رہے سوکنا چلتے سے صاف اٹھا کر دیا مجبوراً ٹھنڈے ٹھنڈے آئے تھے گرم گرم اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئے شرم سے میری حالت تراب میں اپنے ہی کو خیرم سمجھ

نہ ہی تھی کہ اگر میں نہ بیٹھتی تو شاید موٹر خراب نہ ہوتی۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ ہمارے میاں اس کو بھی اتفاقاً کہتے ہیں۔ ہر حال انھیں عشق میں کچھ سمجھائی نہیں دیتا اور یہاں دن رات کا یہ سابقہ زندگی اجیران کئے ہوئے ہیں اگر ممکن ہے چھٹکارا پالے گا کوئی ٹوٹکا عنایت کریں تو یا عشت تشکر ہو گا۔ !

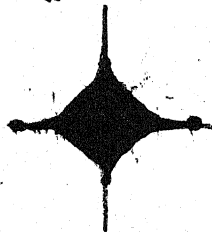


لطیفہ

کابل گئے مٹکل (مغل) بن آئے پھر سے مورِ سانی
آب آب کمر مر گئے سر جانے دھرا، رہا پانی
قصہ یوں ہے کہ ایک ہنیا کماٹی کیلئے کابل گیا وہاں فارسی
سیکھی، گھر آیا تو بیمار پڑ گیا۔ نزع کی حالت میں پانی مانگا۔ چونکہ
فارسی بولنے کی عادت تھی۔

بجائے پانی کے آب آب کہتا رہا :
گھر والے سمجھے نہیں اور وہ مر گیا، مرنے کے بعد تیمار داروں کو پتہ
چلا کہ پانی کو آب کہتے ہیں، تب

یہ دوہا بنایا گیا.....



بن بلائے مہمان

~~~~~

عنوان تو آپ نے سن ہی لیا اب رہا اس پر اظہار خیال تو جناب یہ بڑی تیز محی کھیر ہے کیونکہ یہ خالص گھریلو معاملہ ہے اور آپ جانتی ہیں کہ صبح سے شام تک دس قسم کی باتیں ہوتی تھیں ہیں چند باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ چار کے بیچ میں بیٹھ کر کیا جاسکے ورنہ اکثر واقعات پر وہ پڑا رہنے ہی میں اپنی عافیت ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ پردہ بھی محض دل کی تسلی کے لئے ڈالا جاتا ہے یوں اسکی پائنداری پر ہموک تو شبہ ہے کیونکہ انسان وہ جانور ہے جسکے کان کتے کی ناک کی طرح کام کرتے ہیں۔ جستجو اور کھوج انسان کی وہ خصوصیت ہیں جو اسکو حیوانوں میں ممتاز کرتی ہے اور بات کا منکر بنانے میں تو انسان کمٹائی نہیں۔ اب آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ گھریلو معاملات پر پردے کی کیا حقیقت ہے! کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بات سے بات نکلتی ہے تو آئیے مافی کے جھروکوں سے ذرا دبیز جھلدار پردے سر کا کر چھانکیں اور مہمان اور میزبان کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں۔

ایک وقت تھا کہ مہمان کا آنا باعثِ رحمت تصور کیا جاتا تھا۔ ہر وقت گھر مہانوں سے بھل رہتا کھانا، پکواتے وقت آتے گئے کا افسانہ خیال رکھا جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کھانے کے وقت کوئی آجائے اور کھانا کم پڑ جائے گویا یہ بات طے شدہ تھی کہ مہمان آتے تو بغیر کھانا کھائے نہ جاتے۔ مہمان کی آؤ بگت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہتا بن بلائے مہمان کی محض اس لئے خاطر مدارات ہوتی کہ اسکو یہ احساس نہ ہو کہ عین کھانے کے وقت آگیا ہے گھر کے چھوٹے بڑے سب ہی اسکو گھیرے رہتے اور طرح طرح سے خوشی کا اظہار کرتے بے وقت کے مہمان سے اتنا ہٹ تو دور کی بات ہے اگر کسی دن مہمان بنا دسٹر خوان پر بیٹھتے تو کچھ کمی مٹی محسوس کرتے۔ غرض یوں مہماندار یوں اور میزبان یوں میں سرشار رہا کرتے نہ سینما کا خیال آتا نہ کلب کا تصور یہ! ہوتا سب ہی اپنے ماحول سے مگن تھے بلکہ مدہوش تھے کہ اچانک صبح ہو۔



آگے اب جو ذرا سنبھلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں تھا ہے جسکو ہم بڑے احترام کے ساتھ راشن کارڈ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کارڈ کے سائز کی مناسبت سے ہمارا رزق اترنے لگا۔ مودی خانے کی کوٹھڑیوں میں چوبے لوٹ لگانے لگے اناج کے تھیلے جنکو کبھی اپنے کوتاہی دامان پر شرمندہ ہونا پڑتا تھا غیر ضروری نظر آنے لگے غرض کارڈ کے ساتھ ساتھ باورچی خانے اور مودی خانے کی ہر چیز سکڑ کر رہ گئی راشن کا اناج گھر والوں ہی کو پورا پڑ جائے تو سمجھتے معجزہ ہو گیا غرض نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھاتے۔ ان حالات میں اگر بن بلائے مہمان آتے رہیں تو سوچئے کہ بے چارے میزبان پر کیا گذر قی ہوگی شاید ہی کوئی گھر ہوگا جہاں ایسے مہمانوں نے دھاوا بکھڑکے ہوں۔ اس نازک مسئلہ کو نہ چھیڑا جاتا تو اچھا تھا مگر کیا کیجئے کہ ہمکو باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس عنوان پر اظہار خیال کریں بلکہ ڈھنڈورا بھی پیٹیں یوں کھلے عام اظہار خیال کرنا ~~محظوظ~~ پیٹنے کے برابر ہے۔ بڑا خوف یہ ہے کہ میرے خیالات کا اثر میرے دوستوں پر کیا ہوگا۔ کہیں خفا ہوئے اور آنا جانا ہی چھوڑ دیا تو میں کہیں کی نہ رہو گی بھلا دوست بنا بھی کوئی زندگی ہے؟ مضمون کیا سنانا ہے اچھی خاصی برائی مومل لینا ہے۔

بہر حال جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ تو لیجئے آگئی میں اپنے موضوع کی طرف کچھ تجربے ضرور ہیں لیکن آپ جانتی ہیں جب تک مبالغہ آمیز نہ ہو بات میں مزہ کہاں؟ بن بلائے مہمان ہر زمانے میں گذرے ہیں اور جیتک انسان گوشہ نشینی اختیار نہ کرے یہ آتے رہ گئے، انکو تین حصوں میں یہ آسانی بانٹا جاسکتا ہے، رحمت، رحمت، اور بلائے ناگہانی، اس میں قصور بن بلائے مہمان کا کبھی نہیں ہوتا بلکہ میزبان اپنی حماقتوں کا غمیانہ بھگت ہے۔ حماقتوں کے لفظ پر چڑکیے نہیں! خوش اخلاقی، لطافت، انکساری اور بے تکلفی جسکو ہم انسان کے کردار کی اعلیٰ قدروں کا نام دیتے ہیں، دراصل یہ وہ حماقتیں ہیں جنکا جواب نہیں۔ یہی انسان کو لے دو تھیں اور گھر گھر ہستی کے معاملے میں آپ واجبی بھی واجبی میں تو سمجھئے بڑا غرق ہے۔ اور اتفاقات پر کسی کس ہے اتفاق ہی سمجھئے کہ ماما دودن کی رخصت پر ہے باورچی خانے سے پیار نہیں مارے باندھے کچھ بڑا بھلا کالیا لیا باورچی



پڑتی۔ مشکل دل کو سنبھالا اپنے کو انحصار کے سہنے میں ڈھالا گویا پھر حماقت فرمائی، بڑی فراغِ دل سے گویا ہوئے ”آؤ اب بھی ہم کہاں جاتے ہیں گھر کی مصروفیت فرصت ہی کب دیتی ہیں آنے جالگی“ ادھر سے ارشاد ہوتا ”اللہ کا شکر ہے میں تو تیاری دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی ابھی آج تو ہم تمہارے پاس دن گزارنے آئے ہیں“ سوائے اسکے کہ آپکی زرہ نوازی ہے ہم اور کہہ ہی کیا سکتے تھے۔

دوران گفتگو معلوم ہوتا کہ انکے شوہر بھی دور سے پرے گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں بور ہو رہی تھیں ہمارے پاس دل بہلانے چلی آئیں اب خدا کی اس نیک بندی سے کون پوچھے کہ آپکی بوریت کی سزا ہم کو کس علت میں مل رہی ہے۔ کاش اطلاع کر کے آتیں تو ہم نہ صرف ان کو دن گزارنے بلکہ کئی دن گزارنے کی دعوت دیدیتے کیونکہ آخر ہمارے شوہر بھی تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔

تعطیل کا دن ہے کھانے پر بیٹھے ہیں تقریباً آدھا کھانا ہو چکا ہے کہ دستک کی آواز آتی ہے ایک بے تکلف دوست مصدق بیوی کے نمودار ہوتے ہیں۔ مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ جواب ملتا ہے ”یار کمال کرتے ہو تم نے تو بچوں کو مات کر دیا بھلا کوئی شریف آدمی اتنی جلدی کھانا کھاتا ہے!! اچھا صاحب چلے آپ بہت شریف آدمی ہیں کھانا نہ کھائے یہاں بیٹھو تو جانیے! دیکھا آپ نے حماقتوں کی انتہا ہے۔ دوست صاحب بیوی سمیت کھانے کی میز پر آ بیٹھے ہیں۔ چند نہ گزرے ہوئے کہ ارشاد ہوتا ہے ”واہ دال تو شکل سے بڑی لذیذ معلوم ہوتی ہے ضرور بھائی پکانی ہوگی“ کچھ وقفے سے یوں گویا ہوتے ہیں ”بھی آپکی ماما پھلکے تو بہت عمدہ بناتی ہے پھر اپنی سیگ سے مخاطب ہوتے ہیں میں جو ہمیشہ جس قسم کے پھلکے چاہتا ہوں دیکھو میری مراد ایسے ہی پھلکوں سے ہوتی ہے۔ بھئی تم انکی ماما سے سیکھ ڈالو تو اچھے پھلکے تو کھانے کو ملیں۔

اب ان تبصروں کے بعد ظاہر ہے کہ ان کو بند کرنے سے رہے مہمان کو کھانا کھانے پر مجبور کیا جاتا ہے پھر لیجئے ہم کہاں ہماری پلیٹ کہاں جا کر ماما کو پھلکوں کے لئے اٹا دیا اور ہدایت کی دال اور خشک کم پڑے تو اپنے لئے دوبارہ پکالے مگر خدا کے لئے اس میں سے بچانے کی کوشش نہ کرے غرض یوں، بن بلائے مہمان رحمتیں لاتے ہیں یا نہیں البتہ رحمتوں سے ضرور دوچار کر دیتے ہیں۔

بلاتے اور بن بلاتے کا نمایاں فرق یہ ہے کہ دعوت دیکر بلاتے جانے والوں کا ایک وقت مقرر ہے لیکن بن بلاتے مہمان دن بیکے کسی حصے میں ٹپک سکتے ہیں، حتیٰ کہ بعض مارے بے تکلفی کے رات کو بھی آدھکتے ہیں انکے یہاں صبح دوپہر شام اور رات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ صبح کا وقت انتہائی مصروفیت کا ہوتا مگر میں حیران ہوں کہ اس وقت لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر چلے آتے ہیں جبکہ ہیکونہ انکے ساتھ بیٹھنے کی مہلت ہوتی ہے نہ بات کرنے کی فرصت۔ دوپہر کو جب تمام کاموں سے فارغ ہو کر ایک عمدہ بھی کتا ہاتھ میں لیکر لپٹی ہیں اور جب کتہ کا انتہائی دلچسپ حصہ آپ کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ اچانک مہمان کی آواز آپ کے کانوں میں گونج اٹھتی ہے جس پر آواز سے زیادہ ہم کے دھماکے کا گمان گزرتا ہے۔ شام کو کسی بیمار کی عیادت کو آپ گھر سے باہر نکل رہے ہیں کہ ایک جہان نازل ہوتا اور کچھ اس طرح جہم کر بیٹھتا کہ آپ کو خود اپنے بیمار ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

رات کے دن بچے چمکے میں شب خوابی کے لباس میں آرام سے اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹے دن بھر کے مختلف واقعات یا پھر حالاتِ حاضرہ پر تبصرے ہو رہے ہیں کبھی کبھی ادنی گفتگو میں محو ہیں کہ مظلوم ہوتا ہے کہ ایک عدد مہمان نازل ہوا ہے ذرا غور کا مقام ہے کہ اس حادثے سے آپ پر کیا گذرتی ہوگی۔ صبح اٹھکر جو مراحل سے آپ گزر چکی ہیں اسکو پھر دہرائیے یعنی کپڑے تبدیل کیے، کنگھی کیے اس اچانک حملے سے جو آپ کے چہرے پر تاثیر پیدا ہوا تھا اسکو دور کیجیے ان تمام حماقتوں کو جنکو ہم مہمان نواز اور خوش اخلاقی جیسے نام دیتے ہیں اپنے اوپر طاری کیجیے۔ اور مجسم اخلاق بنکر مہمان کی پذیرائی فرمائیے۔ غرض کہاں تک لکھا جائے ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے تو کیوں نہ راضی ہو رضا رہے۔ سچ پوچھئے تو اس بھگم بھاگ کے زمانے میں کس کو اتنا ہوش ہے کہ کہیں جانے سے پہلے باقاعدہ پروگرام بنائے اور وقت مقرر کر کے جائے اب تو یہ بھال ہے کہ کشمکش حیات سے ایک لمحہ کی بھی فرصت ملتی ہے تو جی چاہتا ہے عزیزوں اور دوستوں کے درمیان گزار دیا جائے اور یوں گھڑی بھر کی ملاقات کو ترسے والے وقت اور تاریخ کی پرواہ کئے بغیر ملاقات کو کل پکڑتے ہوتے ہیں اگر ان ملاقاتوں کو بن بلاتے مہمان کا نام دیا جائے تو سراسر زیادتی ہوگی۔

اتنا کہنے کے بعد بھی میں بخوشی کہ مہمان ہر حال مہمان ہے جو اپنے ساتھ رحمتیں لاتا ہے اور یہ میرا ایمان ہے بن

# انہیں شکایت ہے

سلیقہ مندی کی تعریف ہم بچپن سے کچھ یوں سنتے آئے تھے کہ جس عورت کو میاں کی کمائی سلیقے سے خرچ کرنا آئے بچوں کی تربیت میں دلچسپی لے اور سوئی اور ڈولی دونوں کا صحیح استعمال آتا ہو وہ سلیقہ مند کہلانے کی مستحق ہے۔

جناب خدادی سے پہلے ہم نے اس تعریف کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور اپنی جگہ مطمئن تھے کہ ہم ایک سلیقہ مندی ہوئی ثابت ہوں گے۔ لیکن جب واقعی بیوی کی گدی سنبھالی اور گھر میں معاملات کی باگ و بار سنبھالیں تو پتہ چلا کہ ہم قطعی اس کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ قدم قدم پر دوسروں کو ہم سے شکایت کا موقع ملتا رہا۔ یوں معلوم ہوا کہ جس طرح بیوی بن کر ہم نے اپنی سلیقہ مندی کا اسکہ جمانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس طرح ہمارے میاں نے بھی گھر بسانے سے پہلے ہی شکایتوں کی ہلیک فہرست تیار کر لی تھی۔ اب ایسی صورت میں ہم سوائے بوکھلا جانے کے اور کبھی کیا سکتے تھے اور پھر تو خدا بچائے بوکھلاہٹ میں کیا کچھ کر گزرے۔ اور سلیقہ مندی کی تعریف خدا بچائے ہمارے ذہن سے کب اور کہاں پھسل پڑی۔

شادی کے تعلق سے بعض حکماء نے بڑی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ ویسے تو ہماری معلومات اس معاملے میں بہت محدود ہیں۔ صرف سنی سنائی سنی بات ہے کہ غالباً شیخ سعدی یا شاید حکیم سقراط سے کسی نے دریافت کیا کہ ”جناب شادی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔“ شادی کرنا مناسب ہے یا نہیں۔؟ جواب ملا کہ ”بھائی شادی ایک ایسا پھل ہے کہ جو کھائے سو چھٹائے نہ کھائے سو چھٹتا دے۔“ ان بزرگوں کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ فی حد

لوگ ایسے میس گئے جو کھا کر چھٹانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

شادی کے بعد چند دن تو خواب سے گزر جاتے ہیں۔ یہ ہوش کس کو رہتا ہے۔ کہ میاں بیوی ہیں۔ اس وقت تو ہر بیوی اپنے کو محبوبہ ہی سمجھتی ہے اور شوہر صاحب سراپا عشق بنے رہتے ہیں۔ بیوی کے منہ سے نکلا ہر لفظ پھول جھرتا نظر آتا ہے۔ ہر حرکت میں برکت نظر آتی ہے۔ اس کی لغزشیں بھی ادائے دلبری سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ لیکن اس وقت ہوش ٹھکانے لگتے ہیں۔ جب بیوی کی اداؤں میں بھی بھونڈپن نظر آتا ہے۔ اور بیوی حیران ہو کر سوچتی ہے کہ یہ دم بھر میں کیا سا برا ہو گیا۔ مگر شاباش ہے بیوی کے کلیجے کو کہ صبح سے شام تک اعتراضات کی بوچھاڑ کو برسات کی پہلی پہوار سمجھ کر لطف اٹھاتی ہے بلکہ گھر کے دوسرے فرائض کی طرح ان اعتراضات کو بھی ایک گھیرلو فرض سمجھتی ہے۔

ایک بات واضح کرتی چلوں کہ یہاں ان بیویوں کا ذکر نہیں جن کے صبح و شام جلسوں ہوئیں یا سناں سداہار کی سنگوں میں بسر ہوتے ہیں اور جن کے بچے بورڈنگ ہاؤس یا لارمین کی گودوں میں پلتے ہیں۔ میری گفتگو ماحضوع میری ہی جیسی متوسط گھرانے کی بیویاں ہیں جن کی زندگی شوہر کی خوشنودی پر منحصر ہے۔ آئیے آگے پڑھیں۔

یاد نہیں پڑتا کہ شادی کے کتنے دن بعد ہم نے شکایت کا موقع فراہم کیا۔ لیکن استغفور یاد ہے پہلے اعتراض ہی نے ہم کو گہری نیند سے چونکا دیا۔ اور کچھ دیر یہ سوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ کہ یہ اعتراض با موقع تھا یا بے موقع۔ اور ابھی کسی نتیجے پر نہ پہنچے تھے کہ شکایتوں کا وہ اہم لگانہ ہم نے کسی نتیجے پر پہنچنے کا ارادہ قطعی ترک کر دیا۔ اور ہر بیوی کی طرح ہم بھی چند دن میں اعتراض پروف بن گئے۔ سالن میں مہالوں کا غلط استعمال، کپڑوں میں بن ٹوٹے ہوئے پائے جانا۔ اوزخوں کی بدتمیزیاں۔ یہ تو ایسی شکایتیں ہیں جن کو ایک حد تک بیوی کے چھوڑنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اپنی کوتاہیوں کے بارے میں صفائی پیش کرنے کی اجازت بیوی کو مل جاتی تو شاید اعتراض سے گریز کرتے۔ مثلاً پکوان ہی کو لیجئے۔ میں اس کا پورا یقین ہے کہ ہمارا شوہر

کسی طرف سے بھی کسی شاہی رکابدار سے نہیں ملتا اور نہ ہی شادی کی یہ اولین شرط قرار پائی تھی کہ لڑکی ماہر پکوان ہو پھر شادی کے بعد ہم سے بہترین پکوان کی توقع رکھنا آخر کہاں کا انصاف ہے۔ ہم نے اپنے مقصود بھر کو شش بھی کہتے ابوں کی مدد سے کوئی بہترین چیز پکا کر میاں کی خوشنودی حاصل کریں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اب ہی دیکھئے اتوار کا دن سمجھ کر سوچا لاڈ لکچہ اچھی چیز پکا لی جائے۔ روز تو بے جا رہے بھگم بھاگ میں کھاتے ہیں، ہفتہ میں ایک ہی دن تو کھانے سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مگر تو بے کیجئے اعتراض نہ کریں تو مالک و مختار کا اظہار کیونکر ہو۔ نوالہ منہ میں رکھتے ہی ارشاد ہو گا۔ ٹھیک تو ہے۔ لیکن کچھ کسر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دادی جان مرحومہ کیا لذیذ مہاجی بیگن پکاتی تھیں کہ اس کا ذائقہ آج تک زبان پر ہے۔ اس وقت غریب بیوی یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتی ہے کہ آیا وہ دادی جان بن کر مرے سے دینی یا موجودہ حیثیت ہی میں خوش رہنا چاہیئے۔ دل میں یہ ضرور خیال آتا ہے کہ دادی جان کے ہاتھ کا سالن پوتی پوتانے ضرور چٹنی ارے لے لے کر کھایا ہو گا لیکن دادا جان مرحوم سے دادی جان کے پکوان کے متعلق کیا رائے قائم کی تھی۔ دادی جان کا دل ہی جانتا ہو گا آپ خواہ کتنی ہی توجہ سے ان کے کپڑوں کی درستی کرتی ہوں گی۔ لیکن اگر مہینوں میں ایک دفعہ بھی قمیض کا بلٹن ٹوٹا ہو اور ہارے جائے تو سمجھ لیجئے آج تک کی دیکھ بھال پر پائی پھر گیا۔ فوراً پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ آخر تمہیں گھر میں کام ہی کیا ہے بیسار بیٹھی رہتی ہو۔ اگر کپڑوں کی درستی کر دیا کرو تو کیا ہرج ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ہم گھر میں بیکاری تو بیٹھے رہتے ہیں۔ اب اگر حرف شکایت ہم بھی زبان پر لے آئیں اور گھر میں اپنی بیکاری کی فہرست پیش کریں تو نہایت معصومیت کے ساتھ کہا جائے گا بخدا میرا مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا میں تو محض توجہ دلاتا ہوں۔ چاہتا تھا کہ تم اس کا اتنا اثر نہ لو گی۔ اب آپ ہی بتائیئے اس سادگی پہ کون نہ مرجائے لے خدا! گویا اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ اعتراض نہیں تعریف تھی اور آئندہ بھی جو کچھ ہو گا اس کو ہم اپنے حق میں دمانے خیر سمجھتے رہیں گے۔

خیر یہ تو تھیں گھر بیروزہ داریاں جس میں بقول میاں کے بالکل انارڈی نکلے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے مواقع آتے ہیں جب ہم کو پھوہڑ کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صبح بستر اٹھتے ہی اخبار ہاتھ میں آجنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہماری غفلت کا نتیجہ ہے۔ جناب کے اخبار پڑھنے کی ارادہ بھی بڑی پیاری ہے۔ یعنی گھر میں جہاں جہاں بھی جائیں گے۔ اور جائیں گے ضرور اخبار ساتھ ساتھ چلے گا اس انداز سے کہ ہر جگہ ورق چھوڑتے جائیں گے۔ گویا "چمن" میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستان مہری "بیوی کا کام ہے کہ ان اور لاق پر نظر رکھے کہ کون صفحہ کہاں رہ گیا ہے تاکہ میاں کے پڑھنے میں تسلسل باقی رہے۔ اگر ذرا بھی صفحہات میں بے ترتیبی پیدا ہوئی تو جھلا سمارے ان پر ٹھہر ہونے میں کس کو کلام ہے۔ اخبار میں اس قدر تنہک رہتے ہیں کہ ناشتہ کے بعد دفتر کی تیاری کے لئے وقت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور بھی جلدی کا کام شیطان کا کئی کئی بار تو الماری کھلتی ہے۔ کپڑوں کا ڈھیر پلنگ پر اتارے ہوئے کپڑے زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ بمشکل تمام دفتر سدھارتے ہیں۔ دس منٹ میں فون آتا ہے۔ فلاں فلاں کاغذ اور قلم بھول آیا ہوں بھیجو۔ اتنا پتہ نڈارو۔ یہ نام ہمارا ہے کہ کپڑوں کے انبار میں غسل خانے میں کھانے کی میز پر عرض جہاں جہاں سرکار نے قدم رنجہ فرمائے تھے ان چیزوں کو تلاش کر کے بھیجو۔ اگر اس تلاش میں نامیابی ہو تو یہ ہماری نہایت غیر ذمہ دارانہ حرکت تصور کی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہم میں مفقود ہے۔

ہم کو علم نجوم اور علم غیب میں بھی طاق ہونا چاہیے تاکہ میاں کے ارادوں اور پروگراموں سے واقف رہیں۔ جو وہ کبھی زبان پر نہ لائے ہوں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہونا چاہیے کہ آج جتن بھی مدد اس جا رہے ہیں۔ آگے آپ کو خود اندازہ کر کے سامان سفر تیار کرنا ہو گا کہ سفر کس نوعیت کا ہے۔ دفتری کام ہے، ستادی میں شرکت ہے یا خیر اندازہ کرے کوئی غنی کا موقع ہے۔ بیوی کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے میاں کی آمدنی سے بہتر کوئی کسولی نہیں۔ کیونکہ



گھر کے تمام کاروبار کا اخصار اسی پر ہے۔ یہ ایک دہم اور عام شکایت ہے۔ کہ بیوی فضول خرچ ہوتی ہے۔ اس کے حساب کتاب میں بچت کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ ہر گھر کی طرح ہمارے گھر میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہتا ہے۔ کہ آخر بچت کیوں نہیں ہوتی ہمارے میاں سبھی بولی طبیعت کے انسان ہیں اور اپنے متعلق یہ خوش فہمی بھی رکھتے ہیں کہ بہت کفایت شعار ہیں۔ لہذا انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک جینہ وہ گھر جلا کر دکھائیں گے کہ دیکھو بچت یوں ہوتی ہے اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ ہم نے اس کے اس نیک خیال کی دل سے داد دی اور اس مبارک جینہ کے آٹے سے پہلے ہی فرحت کے اوقات کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا ایک خوبصورت پروگرام مرتب کر ڈالا۔ پہلی تاریخ کو حسب عادت محرم نے تنخواہ ہمارے حوالے کرنا چاہی ہم نہایت ادب سے یہ کہتے ہوئے لینے سے معذرت چاہی کہ آج سے ہماری رخصت خاص شروع ہو رہی ہے اب اپنے ہی گھر میں ہماری حیثیت ایک تماشائی جیسی تھی اور اس وقت جو تلف تماشائی بن کر اٹھایا تمام عمر اس کی لذت نہیں بھلائی جاسکتی تھوڑے دن تک گھر میں دن عید اور رات شب برات رہی لیچوں کی ہر جا دے جا فرمائش پوری کی گئی ہر روز مرغ پھلی کھانے کو ملی پھول کونا شے پروردہ داندے کھلائے گئے۔ ڈھیروں میوہ گھر میں نظر آنے لگا۔ وقتاً فوقتاً ہم کو بھی سنایا جاتا کہ ہم نے ان کے بچوں کو ترسا تو سار کو کھانے کو دیا۔ پھر بھی ہنگامی کارروائی رہا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سارا جوش تھنڈا ہو گیا رفتہ رفتہ مٹا پھلی غائب ہو گئی بچے پھر ایک انڈے پر آگئے بیوے کا نام و نشان باقی نہ رہا اور آخر وہ دن آ پہنچا جس کا ہم ہلکے بے حسینی سے انتظار تھا یعنی میاں نے اپنا تک ایک دن مزد جانفراستیا کہ تنخواہ ختم ہو گئی۔ ہمارے منہ سے خدا کا لفظ نکلتے نظر تڑ گیا اور سبھل کر یاد دلایا کہ ابھی تو منہ ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی ہے پوچھا پھر کیا کیا جائے کچھ ایسی معصیت مشورہ مانگا گیا تھا کہ ہلکے سچ دم آگیا ہم نے ہمداری کھول کر کچھ رقم پیش کی کہ فی الحال اس سے کام چلیں حیرت سے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے پوچھا یہ کہاں سے آئی ہم نے عرض کی میں بچت ہی بچتی

اس کے بعد یہ فائدہ ضرور ہو کہ وہ دن اور آج کا دن بچت کا موضوع درمیان گفتگو نہ آیا۔  
 برس بابر س کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میاں بیوی کے رشتہ کو مضبوط سے مضبوط  
 تر کرنے کے لئے شکایت کرتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ لوگ جھوٹک ہوتے رہنا چاہیے  
 ابی جناب ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق، جس گھر میں گلے شکوے نہ ہوں وہ بھی کوئی  
 گھر ہے، میرا تو جی گھر اجاڑے۔ بھلا بتائیے آپس میں نہ جھگڑیں تو کیا راستہ حلوتوں سے الجھنیں، فوج  
 ایسا ہو! ذرا ان شکووں کے پیچھے جھانک کر تو دیکھئے کتنا خلوص کتنا پیار اور کسی یگانگت ہوتی ہے  
 ان چھوٹے چھوٹے شکووں میں اور پھر برا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ ●

## قاضی صاحب اور ادب لطیف

ایک دن میں نے دیکھا کہ سوج کدو دشنی نہایت ٹھنڈی اور موسم گرما کی ہوائیں بے حد  
 خشک ہیں۔ تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری ہے اور .... میں ایک میز کے سامنے تنہا  
 بیٹھا ہوں۔ کاغذوں اور کتابوں کا انبار میرے سامنے ہے اور میرا تلم و جو دروہانی اساتذہ سلف  
 کے ان دماغی بلبلات رہا ہے۔ جو میرے سامنے پھوٹے پڑے ہیں۔ عظمت گزشتہ کی یاد گاریں سکون  
 دیرینہ کے افسانے شاہراہ حیات کے بہت سارے نشان راہ شہرت کے مینار دولت کے شکستہ  
 دروازے عزت کے نقش ہمارے در دے افسانے غرض کہ اس چھوٹی میز پر ایک عجیب اور میں  
 .... نہ اتنا بلند ہوں کہ خدا کی مخلوق مجھے موضوع کہ ہم رتبہ نظر آئے نہ انسانیت ہوں کہ خلقت  
 کے گرداب معصیت میں پھنس جاؤں اس سڑک کی طرح جو دھندلے کے پہاڑ سے جدا ہو جاتا ہے گزشتہ دلوں  
 کے پیام مجھ تک آتے ہیں اور میرے پیام ان تک جاتے ہیں پر میرا سکوت مطلق اسی دنیا میں جھلکوا ہوا  
 سے الگ ہے نظر ہے ایک فقیر کہ جس پر رکھیاں بھکد ہی ہیں اور ایک رئیس کا اس پر مستند کے موقی اور  
 خشک کے برے کھار ہو رہے ہیں ہر طرح آموزی میں میرے لئے ممکن ہیں۔

قریباً یہ یا بھونڈا یا اس معاملے میں بچے سب سے زیادہ جیغور ہو سکتے ہیں۔ وہ زبان سے جھلی نہیں کھاتے بلکہ ان کے بطور طریقے ان کے ماحول کی غمازی کرتے ہیں کہ سلیقہ ہے بے تربیتی غرض احساس جمال زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے سماجی زندگی، ہونا مگر ماحول ہم آہنگی اور مناسبت بہت اہم اصول ادا کرتے ہیں ہم آہنگی اور تناسب سے معن میں پار چاند لگ جاتے ہیں جس طرح سارے آواز کی ہم آہنگی دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے لہذا گ وقت اور موسم کی مناسبت سے الپا جاتے تو جدید کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح گہری اموں زندگی کے چلن میں برتا جاتے تو احساس جمال کہلاتا ہے یہی وجہ ہے کہ گھر کی بناوٹ ہو یا سماجی یا لباس کی تلاش ہونے لگیں کا انتخاب ہو یا چیزوں کو برتنے اور رکھنے کی بات ہو وقت اور موسم کی ہم آہنگی اور مناسبت پیش نظر رہتی ہے ہر موسم اپنا ایک مزاج رکھتا ہے اور انسان اس سے مناسبت کر کے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے اپنے حقوق اور احساس جمال کے مطابق بدلتے موسم کے آثار چمکاتے ہیں۔

زندگی زندہ ہوتا ہے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کچھ دیر کو فرار کا اندیشہ ڈھونڈ لگتا ہے۔ ہر شخص اپنا ایک نظر عین حیات رکھتا ہے کسی کے نزدیک ”نام ہے مرم کے جینے جانے کا“ اور کسی کے نزدیک ”زندگی زندہ دنیا کا نام ہے“ میرے نزدیک زندگی نام ہے قرینے کا توازن کا۔ یہ ہر زندگی گذارے اور پورے حواس کو جگانے کے لئے احساس جمال چاہیے۔

اللہ پاک نے زندگی عطا کی سلیقے سے جینے کے لئے غفل کا رہنمائی بھی ملے اور اختیار بھی! جیہ کہ کیا بقول اقبال ”تو شب افریدی، چراغ افریدیم“ یعنی تو نے رات بنائی اور میں نے آگ کو چراغ سے روشن کر دیا احساس جمال زندگی کا چراغ بھی تو ہے!!

احساس جمال اپنے میں اتنی وسعت رکھتا ہے کہ چند صفحوں میں اس کا سمجھنا ناممکن ہے بڑی خوشی کتابت تعویہ ہے کہ اب ادبیات کی اعلیٰ تعلیم میں جمالیات کو بھی داخل نصاب کیا گیا ہے خوش نصیب ہونے کے وہ طالب علم جو زندگی کے صحیح راستے تلاش کرنے میں اس شعبہ سے پورا پورا استفادہ کرینگے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رنگ بھر کر ایک حسین دنیا آباد کرنے میں اہم کردار ادا کرینگے۔



اعلان تو ہو ہی چکا تھا باوجود اپنی طرف سے فیشن کے تمام نقصانات گنواہے اور یہاں تک کہا کہ  
کہ بھی بڑھی گھوڑی کو بھی لال لکام نہیں سمجھتی ہم تو پھر انسان ہیں! ہماری ایک نہ چلی ہماری  
ہر شکل کا حل تلاش کر لیا گیا۔ بالوں کے لئے خضاب جوڑے کے لئے مسونہ بال فراہم کیے گئے رہا  
چہرے کو جوان بنانے کا مسئلہ سوہیٹی صاحبہ نے اپنے نوٹس لے لیا۔

توجاب فیشن بالوں سے شروع ہوا خضاب کا کوئی تجربہ نہیں تھا ترکیب استعمال کا دود  
سے خضاب کا پیالہ سر پہ پھر نہ لگا جہاں دفتر بچے اسکول جا چکے تھے فرصت ہی فرصت تھی پوری  
توجہ کے ساتھ بال کا لے کئے گئے فیشن یہ پہلی ہم سر کرتے کی ٹھانے پانچ منٹ بھی نہ گزرسے  
ہونگے کہ چھوکر اس پر سوار ہو گیا سودا لانے کے لئے پیسے مانگ رہا تھا اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی  
کہ ماما چکیں انھیں یکوان شروع کرنے کے لئے سامان چاہیے تھا خیال تھا جلد ہی تمٹ جاو لی گدولوں  
سے پانچ منٹ کی فلت مانگی اور ایسے بنا د میں مصروف ہو گئی کہ اچانک ماما جی کی آواز نہ بچو نا  
دیا وہ کہہ رہی تھیں ۱۰ بج گئے سودا کیب اس کا یکوان کیب شروع کر دوں گی! پیر ورتلے سے تو زمین  
ہی نکل گئی سچ جی آخر کھانا کیب تیار ہو گا اور بچوں اور کد قریب ہو چکا۔ اگر آپ کو توجہ خضاب کا تجربہ ہے تو  
یقینی میری پریشانی کا اندازہ ہو گیا ہو گا بس چاکچی خضاب جو یوں بھی غالباً ہمارے بالوں کی سفیدی کے  
حساب سے کچھ زیادہ ہی بن گیا تھا انٹامیدھا تھو یا اور باورچی خانے میں گھس گئی اور سوچتی رہی کہ  
یا اللہ فیشن کرنے کو خواتین کو وقت کیسے مل جاتا ہے یہاں تو سر منڈھلتے ہی اُولے پڑ گئے! پھر حال  
جلدی میں یکوان بھی اُلٹا سیدھا ہی ہوا پھر بھی بچوں اور میاں کو دیر سے روانہ کر گیا ضمیر انگ نہ  
کرتا رہا کہ جس کام کا سلیقہ نہیں اسکا شوق ہی کیوں غرض کافی دیر تک بالوں کی طرف دھیان نہ  
گیا جب کاموں سے فارغ ہوئی اور کو وقت کم ہوئی تو سر مبارک کی طرف پھر توجہ مبذول فرماؤ  
اب جو آئینے میں دیکھتی ہوں تو بال ہی کیا مانگ تک کالی ہو چکی ہے چہرے پر جابجائے کالے ٹپکے  
لگے ہیں ہاتھوں پر نظر پڑی تو تمام ناخن خضاب میں سنگ چکے تھے پہلا تجربہ دھوؤں کو دکھاتے  
کی ترکیب معلوم نہ تھی سوائے صبر کے کیا کر سکتے تھے البتہ آئندہ خضاب نہ کرنے کا عہد ضرور کر لیا۔  
اب سُنئے کہ اصل دن یعنی شادی کی سالگرہ کا دن آیا ہو گیا جبکہ ہم کو پوری طرح  
فیشن ایبل بننا تھا خیال یہ تھا کہ ۱۰ بج تک تیار ہو جانا چاہیے تاکہ ہر سال کی طرح گروپ فوٹو اور

سینا کا پر و زمام شام رہا ہے اس لحاظ سے میک اپ کے لئے تین گھنٹہ بہت کافی سمجھے گئے دوپہر کے کھانے کے بعد ہم بیٹی کے کمرے میں داخل ہو گئے چہرے پر سے خضاب کے جیسے مٹ گئے تھے البتہ ناخنوں پر کچھ آئبر باقی تھا چنانچہ یہیں سے شکار کی ابتدا ہوئی پہلے ناخنوں پر سسرنی لائی گئی جس کی بالکل عادت نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگلیں سن ہو گئی ہیں اس کے بعد جوڑا بندھنے کی باری آئی اب مانگ نکالیں تو کہو نہ وہ خضاب کی نظر ہو چکی تھی لہذا BACK COMB کرنا طے پایا ظاہر ہے یہ اتنے ہی سیدھی لکھی کرنا اپنے بس کی بات نہ تھی سر بیٹی کے حوالے کر دیا گیا اور خود آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد جوڑا تیار ہوا۔ پہاں تنگ جوڑی کی عادت اور جوڑے کا یہ حال کہ اب کھلا اور جب کھلا آئینے پر نظر گئی تو برا عجیب حلیہ نظر آیا سر پر جڑیا کا گھونسلہ گردن پر مصنوعی بالوں جوڑا کا مہرے کو ہوا ایس ایک جھونج سمجھ لیجئے کہ جوڑا کھلا ہے بار بار جی چاہتا کھول ڈالو لیکن صاحبہ ادی کا اصرار اے آئی ٹی یہ جوڑا آپ کو کتنا suit کر رہا ہے اب وہ ہم کو سوٹ کر رہا تھا یا نہیں لیکن امتنا ضرور تھا کہ زندگی کا آدھا لطف ختم ہو چکا تھا اس کے بعد چہرے کی باری آئی ہم نے اس کو بھی بیٹی ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں نہ جانے کتنی دیر میں چھٹکارا ملا لیکن اس عرصہ میں ایک پہلو بیٹھے بیٹھے کمر جواب دے چکی تھی بیٹی نے بڑے خیر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے آئینہ دکھایا۔

”آئی ٹی ہنسنا کام! کتنی young دیکھ رہی ہیں آپ۔“ young کا لفظ سن کر دل ہی دل میں ہم بھی خوش ہو گئے اور بڑے اشتیاق سے آئینے کی طرف نگاہ اٹھائی پہلی نظر میں چہرے پر کسی چیز کی کمی نظر نہ آئی غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہونٹ غائب ہیں اور جب وہ نظر آئے تو چیخ نکلتے نکلتے وہ گئی سفیدی مائل لپٹا شک لگے ہونٹ بالکل برص کی بیماری معلوم ہو رہے تھے جو قحطی ناقابل برداشت تھے چنانچہ رنگ بدلنا بھی پٹا جو چیز چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ تھی آنکھیں جن کا خاصا حشر بنتا تھا یعنی سرسریا کا جل کی ڈوری جو آنکھوں کے اندر پھیری جاتی تھی اور جس کی تعریف میں شاعروں نے قلم توڑ دیا تھا ہماری آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر آگئی تھی ڈوری کا پے کو ہوں اچھی حامی کا جل کی سی تھی جو پلکوں پر چرچا دی گئی تھی یعنی آنکھوں سے زیادہ پلکیں نمایاں تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ اولاد کے ہاتھوں یہ گت بن جائیگی ہم نے طے کر لیا کہ اب کھائی تو کھائی پھر کھائی تو رام دھائی!!

اب سید سے ہم مرحلہ ساری کا تھا میں اپنے اسٹائل پر امرار کر رہی تھی اور بیٹی کا امرار  
 تھا کہ صرف ایک ہند کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کا ساری یا ندھا لوں میں نے بھی سوچا جب اگلی میں سوچا تو موصل  
 سے کیا ڈرنا جہاں انہی گت بن چکی ہے چلو یہ بھی سہی غرض خدائے کہاں کہاں (PINS) لگا کر ساری  
 یا ندھی گئی کہ ہم پہلے چلنے کے قابل نہ رہے۔ کل تک جو ہم تحفوں میں توڑا میں کو اس اسٹائل کی ساری  
 یا ندھی دیکھ کر رحم کی نظر سے دیکھا کرتے تھے کہ آٹ سپر بیسیاں کسی اپنے ہاتھوں جکڑی  
 پٹری پڑا مارے فیشن کے نہ آزاد کی کا اٹھنا بیٹھا نہ ہاٹھنا لگا لگا چلتا پھرنا اگ لگے ایسے فیشن کو شکوہ  
 میں پھنس کر رہ گئیں فیشن زدہ تو انہیں پر کھی کھی تو کا بچ کے برتنوں کا شبہ ہوتا ہے کہ وہ فیشن  
 کی اور ٹوئیں۔! تو صاحب بڑے بول کا سر تیری آج ہم بھی انہیں فیشن زدہ خواتین کی صف میں  
 ہاتھ باندھے بے حس و حرکت شامل تھے۔

میاں دفتر سے آچکے تھے اور ہمارے انتظار میں سگریٹ پیسگریٹ پیسگریٹ پیسگریٹ پیسگریٹ  
 تھے آخر تنگ اگر تقاضے شروع ہو گئے گھڑی دیکھ کر اطلاع کی گئی کہ پکچر کا پروگرام لوگیا یعنی وقت  
 نکل چکا۔ یہ مشکل تمام تیار ہو کر یا ہر نکلتا جا ہا تو قدم جیسے رکنے لگے اس حلیہ میں سامنے  
 جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا اللہ کہ رول پٹری مشکل سے کمرے سے باہر آئی یہ وہیں کھڑے تھے جہ  
 پر جو نظر پڑی تو گھڑوں پانی پڑ گیا میری جمیٹ مٹانے کو نہ دیا بنا تے ہوئے بولے اچھا ایک پا  
 تو کھلا وچم چلیں ہم تو تھے ہی بو کھلائے ہوئے یہ خیال نہ رہا کہ فیشن نے ہماری نقل و حرکت  
 کی پوری آزادی سلب کر کے شکنجے میں کس دیا ہے پاتان اٹھانے جو تھکی تو پینوں (PINS) میں  
 انکی ساری جھم سے نکل گئی یہ ہماری پسندیدہ ساری تھی چھٹنا غضب ہو گیا سارا موڈ  
 ہو گیا لیکن میاں کی خاطر منظور تھی اس لئے پروگرام ٹالا ہی نہ جاسکتا تھا اولہ تھی ساری پہن کر  
 باہر جاتا تھی نا ممکن تھا جب ساری بیدلنا ہی ٹھیرا تو سوچا کہ میوہ اپنے اصلی رنگ میں آجاول اس  
 طرح جناب ساری کا چھٹنا ہرانا بن گیا یوں سمجھ بیٹھے کہ پچھاؤں چھینکا ٹوٹا اور شکوے سے آزاد ہو کر  
 اطمینان کا گہرا سانس لیا لیکن ساری اور وقت کی تبدیلی کا خیال کر کے کہنا بیٹھا ہے کہ بہت  
 چھٹا ہے فیشن کر کے !!!



# نئے سال کے عہد

جہاں تک مجھے یاد پڑھتا ہے ہمارے بچپن میں دو سال کا ایک سال ہوا کرتا تھا یا کم از کم محسوس تو ایسا ہی ہوتا تھا لیکن جیسے عمر بڑھتی گئی سال اسی رفتار سے گھٹتا چلا گیا اور نوبت تو یہاں تک پہنچی کہ ہر سال آندھی کی طرح آتا اور طوفان کی طرح گزرتا چلا جاتا ہے اس سے پہلے کہ گزشتہ کیے ہوئے عہدوں کا جائزہ لیں نیا سال سر پر آ جاتا ہے بھلا اس بھاگم بھاگ میں کوئی کیا عہد کرے اور پھر آدمی خواہ مخواہ تو عہد کرتا نہیں کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہی ہوگی ! اور جب عہد کر رہی ہے تو نئے سال کے عہد سے پہلے رخصت ہوتے ہوئے سال کے عہدوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آخر اتنے عہد وہ کہاں جو اس غریب باندھے تھے اس میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی لیکن خدا جانے یہ ڈسمبر کی آخری گھنٹیاں عقل کی آنکھوں پر کیسی پٹی باندھ دیتی ہیں کہ ہم قطعی یہ بھول جاتے ہیں کہ آج تک جو عہد کیے تھے اس میں ہمیشہ شکست فاش کھائی ہے یعنی ان میں سے بعض تو غلطی محض اختیار نہ کر سکے اور جن پر عمل کیا گیا ان کی زندگی بھی بس چند روز ہی ثابت ہوئی مثلاً ۱۹۷۷ء کے آخری دن ہمارے صاحب نے یہ آواز بلند یہ عہد کیا کہ نئے سال سے وہ سگریٹ پیتا چھوڑیں گے اور چونکہ آخری دن تھا اور ہمیشہ کے لئے سگریٹ سے جدا ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے چنانچہ ان چند گھنٹوں میں اتنے سگریٹ پیے کہ اگر حساب لگایا جاتا تو شاید آنے والے سال کا پورا کورٹ تیار ہو جاتا چونکہ اب ہمیشہ کو چھوڑنا ہی تھا لہذا جی بھر کے پینے میں کوئی نقصان بھی سمجھا



سگریٹ کا ایک آخری طویل کش لے کر سو گئے اور جب نئے سال کی پہلی صبح ہوئی تو جھڑپ پر نئے صبح کی تازگی کے بجائے رونے کی سی کیفیت طاری تھی آخر نئے سال کا عہد تھا کوئی مذاق تھوڑی تھا نہ ہیبت ثابت قدمی کے ساتھ دن گذرا صرف دن بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ پورا ایک مہینہ بغیر سگریٹ کے گذر گیا۔ اب یہ نہ بوجھئے کہ کس طرح گذرا جتنی دیر گھر پر رہتے اس طرح ٹھہرتے جیسے کوئی رمضان میں مغرب کی اذان سننے کے لئے شہنشاہی کئی بار گھبراہٹ بھی سگریٹ کے لئے کوئی اذان یا سائرن نہیں ہوتا آرام سے بیٹھو اور دھیان کسی دوسری طرف لگاؤ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان ہمدردی کر بھی کیا کر سکتا ہے اپنے ہاتھوں اپنے پر پابندی یا عائد کرنے کا کیا علاج اعراض مشکل تمام ایک مہینہ گزرا فراق کی پہلی جیسی کیفیت بھی نہ رہی تو جناب کو اطمینان ہو گیا کہ جلو ایک بری عادت سے چھٹکارا ملا لیکن دنیا کی دنیا لینے دیتی ہے ابھی اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک روز ایک مہربان تشریف لائے خود سگریٹ پینے لگے تو ان کو بھی پیش کیا کچھ دیر ادھر سے انکار اور ادھر سے اصرار رہا آخر جی تو نہ چاہتا تھا لیکن اخلاق قبول کرنا ہی پڑا۔ اب کیا تھا ایک منہ لگنے کی دیر تھی کہ ہر وقت یہ خواہش کہ لے کاغذ کوئی سگریٹ نوش قسم کا دوست آئے اور ان کو اصرار کر کے پلائے اور شکر خورے کو اللہ شکر ہی دیتا ہے دوست آئے رہے اور اصرار کر کے پلائے رہے لیکن اصرار پر استحرک تک عمل کرتے ایک دن دفتر سے تشریف لائے تو سگریٹ کا ڈبہ بھی آہی گیا چلے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ جب میاں نے سگریٹ چھوڑنے کا عہد کیا تو مھلا بیوی کیوں پیچھے رہیں جب کہ زمانہ بھی قدم ملا کر چلنے پر مجبور کر رہا ہے! بس ہم نے سوچا کہ جب وہ سگریٹ چھوڑ سکتے ہیں تو ہم کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑنا چاہیئے پان تمباکو کی عادت نہیں تھی البتہ اپنے مزاج کی اصلاح پر توجہ دینا ہی مناسب معلوم ہوا لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ

آخر اصلاح کس چیز کی ہو بظاہر ہر مزاج میں عادات و اطوار میں ایسی خرابیاں نہیں  
جس کی اصلاح ضروری قرار دی جائے اپنی تمام عادتوں پر کبھی نظر ڈالی ظاہر و باطن  
سب ٹھل ڈالا کوئی عیب ہو تو ایسا معلوم ہوا کہ ہم انسان کا ہے کوئی فرشتہ نہیں؟  
اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت ایک تہاوت یاد آئی کہ اپنی آنکھ کا شہیر دکھائی نہیں دیتا  
دوسرے کی آنکھ کا نظر آجاتا ہے۔ یانہ کہ دل کو لگی۔ ہماری آنکھ کے کون کون سے تیکے دو گوں  
کو نظر آئے ہم نے اس پر غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہم بچوں کے ساتھ بہت سختی  
برتتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہماری غلطی نہ تھی بلکہ ہم تو بزرگوں کے اس قول پر عمل کر رہے  
تھے کہ ”کھلاؤ سونے کا قالہ اور دیکھو دشمن کی نظر سے“ بہر حال ہم نے نئے سال  
کا عہد کر ہی ڈالا کہ اسندہ سے بچوں پر سختی نہ کریں گے اور ان کی آزادی کے ساتھ  
پلنے اور بڑھنے کے پورے ذرائع فراہم کریں گے اور خود کو خوش مزاجی کا مجسمہ  
بنا کر پیش کریں گے چلئے صاحب عہد و بیباں ہوئے اور سو گئے صبح کو ایک ہنگامے  
کے ساتھ بیدار ہوئے ابھی کچھ نیند ہی میں تھی کہ کانوں میں طرح طرح کی آوازیں  
آنا شروع ہوئیں جب ذرا نیند کا غلبہ کم ہوا تو معلوم ہوا کہ بچے آپس میں  
لڑ رہے ہیں بہت غصہ آیا کہ ایک تو نیند خراب ہوئی اور دوسرے صبح صبح  
ننڈ کا نام نہ رسول کا لڑائی بھگڑا شروع ہو گیا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لئے  
جھٹکے کے ساتھ اٹھی ہی تھی کہ نئے سال کا عہد یاد آ گیا بمشکل تمام غصہ بچہ  
قابل پایا البتہ یہ کوفت ہوئی کہ آخر پہلی جنوری کو اسکول کیوں بند ہوتے ہیں بچوں  
کو نہایت نرم و مشفقانہ لہجہ میں لڑائی کے عیب و میل جول کے فوائد سمجھائے اور دل ہی دل  
میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑا نازک وقت آ گیا تھا ساتھ خیریت کے مل گیا۔ لیکن بچے  
ہمارے اس عہد سے واقف ہو چکے تھے اور ان کو ہماری کی ہوئی ساری باتوں  
کا بدلہ لینے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا بھلا وہ کیوں جو کہتے تو جناب اللہ کا پہلا دن

یوم حشر ثابت ہو اگھر نقشہ تبدیل کر دیا جتنا ہنگامہ اور جتنی بے ترتیبی کر سکتے تھے وہ اس دن کر کے چھوڑی۔ دن میں کئی بار عقدہ آیا لیکن عہد نبائے کی خاطر علمی کو شربت کے گھونٹ بٹا بنا کر پیتی رہی۔ شام ہونے تک بچوں کا ہنگامہ پورے عروج پر آچکا میرے اعصاب جواب دے چکے تھے اگر کچھ دیر اور برداشت کرتی تو پاگل ہو جاتی تھی یہ ہوا کہ نئے سال کے عہد پر تو سو بار لعنت بھیجی پر بچوں کی خوب مرمت کر کے ایک کمرے میں ڈالا اور خود بلکان ہو کر پڑ رہی اب غور کرتی ہوں تو یہ عہد بھی عجیب مگر خیز حرکت معلوم ہوتی ہے ابھی خاصی اپنی مرضی اور آرام کی زندگی بھڑک رہی تھی بٹھارے نئے سال کے ساتھ عہد کر کے پابندیاں عائد کرنا کونسی عقلی بات ہے دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں تو ایک مثال درج رہی تھی کہ کس طرح عہد کر کے اپنی شامت کو دعوت دیتے ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ پھر بھی بہتر حاصل نہیں کرتے بلکہ جیسے پھر نیا سال آتا ہے تو پھر ایسی ہی حماقتوں کے لئے پوری مستعدی کے ساتھ تیار ہو جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے تو عہد کرنے کو ساری زندگی بڑی ہی بے موقعہ اور حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے عہد کے بہت سے موقع آتے ہیں نئے سال میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ اس کی آمد پر عہد کیے جائیں اور طرہ یہ کہ عہد پورے بھی کیے جائیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بچپن کو چھوڑ کر تیس سال سے مسلسل نئے سال آتے اور جاتے دیکھ رہی ہوں۔ لیکن آج تک کسی نئے سال میں کوئی انوکھا بین نظر نہ آیا۔ سوائے اس کے جب آج تلے دماغوں میں انتشار پیدا کر دیتا ہے عہد تو بہت کیے جاتے ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تیس بات ہی رہتا ہے۔ میری ناخیز رائے تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے نئے سال کے فریب سے بچے اور اگر خدا نہ خواستہ آپ اس کے جال میں پھنسنے کو عہد کو سنبھال رہی ہو جائیں تو عہد ضرور کیجئے لیکن سمجھ کر کیجئے کہ جو کر جیتے ہیں وہی کر لیں۔

فراق کی چلن  
احسان جمال

اعمال حسن جمال

زندگی کا بھی عجیب چلن ہے۔ جب دیکھو ناچو اور رات کو اپنے لیے تلاش کرتی ہے ایسے راسخوں پر پہلنا۔ زندگی بھی عدوت بھی بن گئی ہے۔ اہمیت تینے فرائض کھڑے کر دینا اس کا راج بن چکا ہے ہر وقت مشکلات اور مسائل میں گھری رہنے کے باوجود زندگی سے اتنا پیار کیوں ہے؟ کبھی سوچا ہے آپ نے؟ ممکن ہے اس سوال کے بہت سے جواب ہوں لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں تو مٹی کی زندگی کا صحن یعنی احساسِ جمال جو کائنات میں توازن، تناسب، اعتدال اور قرینہ پیدا کرتا ہے اس کی تقسیم اقبال نے یوں بیان کی ہے کہ

من اتم له انه منك آيئة سالم

من انتم که اندر هر توشینه سازم

(یعنی میں پتھر سے آئینہ بناتا ہوں اور نہ ہر سے آپ حیات بنادیتا ہوں)

اسی سے انسان کے جذبہ تخلیق کو نمکین ملتی ہے اور زندگی پرمیلا آنے لگتا ہے۔ کائنات کے ہر شعبہ میں جمالیاتی پہلو موجود ہے جو زندگی کو بکھرنے سے باز رکھتا ہے۔ احساس جمال خدا ہے جو منڈے پن کی اور بھی بھونڈا پن جب زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور کئی زندگیاں اسکی لیٹ میں آ جاتی ہیں۔

آندگی میں توازن یہ قرار رکھنے کے لئے احساس جمال دل و نظر کے لئے ایک نعمت و برکت ہے جس طرح بنا عودت گھر کا تصور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح احساس جمال سے خروم عودت کا وجود بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

یوں تو احساسِ حمل اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو عطا فرمایا ہے فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل دے کر اسکا صحیح مصروف بھی واضح کر دیا ہے۔ اور عورت نے تو اس جوہر کو بڑی فیاضی اور جا بکرتی

سے برت کر زندگی کے جیلن کو سن جٹا ہے۔

اکثر لوگ جیہ احساسِ جمال کی بات کرتے ہیں ان کی گفتگو سے نیشا تو پیدا ہوتا ہے کہ دولت کا سہارا لئے بناء ذوقِ جمال کی تسکین ہو ہی نہیں سکتی حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ دولت کو سلیقہ سے خرچ کرنے کے لئے احساسِ جمال کی ضرورت پڑتی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ دولت ذوقِ جمال کی محتاج ہے! رو پیے پیسے کے مل پوتے پر گھر کو قیمتی سامان سے تو بھرا جاسکتا ہے بیش بہا نوادرات نمود و نمائش کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں لیکن سلیقہ اور قرینہ نہ ہو تو تسکینِ نظر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اتفاق سے میں نے ایسے گھر بھی دیکھے ہیں جہاں آمدنی کا حساب یہ ہے کہ روزگروں کو دو ادائیگی ہو لیکن ایسے گھر ملک میں جو قریب اور توانا نظر آتا ہے وہ بد ذوق دولت مندوں کو نصیب نہیں۔

چین میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آگئی اگر اسکو یہاں دوہرا دوں تو بے موقع نہ ہوگی کہانی کچھ یوں تھی کہ ایک صاحب تھکے ہارے گھر پر پونچتے تو اچھے اچھے سے رہتے اور بیوی سے کہتے ”بیوی ذرا امن کر بیٹھو بیوی غریب ہر روز تمہاریاں کے آنے سے پہلے سولہ سنگا کے میاں کی منتظر رہتی لیکن میاں کا تقاضہ کہ ”بیوی بن کے بیٹھو“ جوں کا توں ہی نہ تھا۔ آخر میاں کے تقاضے سے پریشان ہو کر بیوی نے پڑوسن کو مورچاں بنا کر اپنی الجھن کا حل مانگا۔ پڑوسن سمجھ دار اور جہاندیدہ معلوم ہوتی تھیں انہوں نے مشورہ دیا کہ ”اب تک تو تم نے بناء سنگار کرتی رہیں اب ذرا گھر کی طرف توجہ کرو اسکو سجا بنا کر رکھو اور دیکھو کہ میاں کیا کہتے ہیں“ بیوی نے سوچا بلویر بھی کر دیکھوں اپنا چہ سارا دن محنت کر کے گھر کی صفائی کی سلیقے سے سجا یا اور خود صاف مگر پلکے پھٹکے کپڑے پہنا کر میاں کا انتظار کرنے لگیں گھر میں قدم رکھتے ہی میاں نے جو بنگ دکھا تو نقشہ ہی دوسرا تھا بے اختیار بیوی کی بلائیں لے لیں اور بولے ”ہاں آج تم بن کر بیٹھیں!!“

میں نے بہت حسین لگ رہی ہو

میاں کو یوں بے اختیار داد دینے پر مجبور کرتے دالا جوہر بیوی کے اندر جاگا ہوا ہے

احساسِ جمال کا فرما تھا۔

احساس جلال کوئی لیکر پیدا ہوتا ہے یعنی خدا داد ہوتا ہے اور کوئی دوسروں کو دیکھ کر اپنے  
میں پیدا کرنا ہے اور کسی کو سچنے کی قدرت نہیں ہے۔

ہر عورت کے فقر میں اسکا اپنا ایک گھر ہوتا ہے اور اس تصور کے ساتھ ہی اس کے  
ذہن میں اسکی آرائش کا ایک خاکہ تیار ہونے لگتا ہے کیونکہ یہ عادت کا فطری جذبہ ہے اور گھر  
تو ہر حال گھر ہوتا ہے چاہے وہ جھونپڑی ہو یا محل مگر فرق ہوتا ہے تو اس کے رکھ رکھاؤ میں کسی  
گھر کی بے ترتیبی اور گندگی طبیعت کو مکرر کر دیتی ہے اور ایک چھوٹی سی کینا سامان مسرت جیسا  
کر دیتی ہے کیونکہ اس میں غنائش نہیں ہوتی بلکہ ذوق نظر کا اہتمام ملتا ہے۔ یہ سادگی اور برکاری  
ہی کا لعل ہے جو گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

زندگی کے چلن میں شادی بیاہ رسم و رواج اور آئیں میں بول یعنی سماجی زندگی کا  
بڑا دخل ہے شادی ہی کو لے لیجئے۔ شادیوں میں رسوم و عہدے اور نمونہ و نمائش کی بھر مار ہوتی ہے  
صاحب حیثیت تو شاید ایس شادی سے خوش ہوئی لیتے ہوں لیکن متوسط طبقہ لاکھوں کی شادی  
بچا کر وقتی مسرت کا سامان کچھ لیتا ہے لیکن قرض کی ادائیگی اور گھر کی دوسری ذمہ داریوں کی فکر اس  
وقتی مسرت کو دائمی مذاپ میں بدل دیتی ہے شادی جیسے متبرک فریضے کی ادائیگی میں اگر توانا اور  
اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے تو خوشی کا وہ احساس جو جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے کبھی ماند نہ پڑے میرا  
خیال ہے کہ سامان کم قیمت ہی بھی لیکن اگر وہ مفاست اور ذوق جمال کا مظہر ہے تو زیادہ برکشت  
اور دل خوشی کی ثابت ہو سکتا ہے۔

یوں تو سماعت بجائے تفریح طبع کے اگر قرض کی شکل اختیار کر لیں تو اپنا حسن کھودتی ہیں  
بعضی رسومات جس بھونڈے انداز میں ادا کی جاتی ہیں کاش وہ ترک کر دی جاتیں۔ چٹھی چھلے کی  
رسومات ان میں سے ایک ہے چند دن کی تنہی سی جان پر کیا کچھ ہمتیں لاد جاتا پکے گوٹے کے کپڑوں  
کی جھن سے بچہ بلبلا کر دیتا ہے کسی کے کلابیر جوں نہیں رہتی بلکہ مزید پھولوں میں جکڑ دیا جاتا  
ہے اس طرح بزرگوں کا شوق و ارماتوں کا تختہ عشق بن جاتا ہے اور یہ تمام رسومات اس قدر  
عقیدت کے ساتھ انجام دی جاتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام رسومات ادا نہ ہوئیں تو  
خدا کو مہر دکھانے کے قابل نہ رہینگے بانیوں کے اس شوق کو غنائش اور دکھاوے کے سوا کوئی

# بہت پچھتائے فیشن کر کے

یظاہر بات بہت معمولی سی تھی۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ کبھی کبھی ذرا سی بات بھی  
 بے فکر بن جاتی ہے۔ اور فیشن کی بات تو کچھ ایسی نہ تھی کہ جس میں کسی حادثے کے رونما ہونے کا اندیشہ  
 ہو تا لیکن یہ قسمت یہ نکلا تھا کہ ہمارے لئے فیشن نے بھی حادثے کی شکل اختیار کر لی

اسا تو ہمیں پتہ ہے کہ ہم نے کبھی فیشن کا نام ہی نہ سنا ہو یا کسی کو فیشن کرتے نہ دیکھا ہو لیکن  
 جس ماحول میں ہمارا بچپن گزرا اور جس ڈھنگ سے ہماری تربیت ہوئی اس کے نقش کچھ اس قدر گہرے  
 ہیں کہ آج کے ماحول میں ہم ان اصولوں کو تلاش کرتے ہیں جو مایوسی حکمانہ دیکھا پڑتا ہے۔ اب یہی چیزیں  
 ناس زمانے میں بھی فیشن کہا جاتا تھا لیکن اس کے کچھ اصول ہوا کرتے تھے مثلاً غر اور حالات کے لحاظ  
 سے کچھ حصوں میں تقسیم تھا۔ شادی شدہ اور سان بیا ہوا لڑکوں کے فیشن میں اتنا نمایاں فرق تھا کہ آپ  
 بہ آسانی ان دونوں میں تمیز کر سکتی تھیں۔ کر کیا آج کل یہ ممکن ہے؟ نہ جانے آپ کا کیا تجربہ ہے مجھے تو کئی  
 بار شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ایک بار میں نے ایک بیگم صاحبہ کو لڑکی سمجھ کر ایک لڑکے کے لئے نشانہ ہی  
 کر دی تھی (ای طرح جب مجھے برادر کے ہو جاتے تھے تو ماؤں میں بھی مزاج کی سفیدگی کے ساتھ ساتھ بڑا  
 لنگھار میں بھی ایک بردباری اور وقار پیدا ہو جاتا تھا) لیکن آج کل کی تو دنیا ہی ترالی ہے فیشن نے  
 چھوٹے بڑے کا فرق ہی مٹا دیا اگر آپ ساس اور داماد کو دیکھیں تو سال بہنوئی ہی کا دھوکہ ہو گا۔  
 تو بھی ہم نے پرانے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور پرانے طریقہ ہماری آنکھوں میں بسا تھا اسی لئے ہم اپنی  
 جگہ پوری طرح مطمئن تھے کہ فیشن میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کیا ہوا  
 کہ زمانہ بہت آگے نکل گیا اور ہم جیسے ساتھ چلنے کے اس کے پیچھے گھسٹنے لگے اور ایسا غمخس ہو کہ ہم زمانے  
 کے ساتھ کبھی تھکے ہی نہیں!! اب جو ذرا حواسوں کو درست کرنے کے زمانے پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہیں  
 جہاں سے میلے نیمھے یعنی فیشن کا سایہ بھی ہم نہ پڑا تھا وہی تیل لگے بالوں کی تنگ چوٹی، ہاتھوں میں جھیلیاں

# بی جاو

حالات زندگی کچھ جائیں تو پھر لے کر تاریخ پیدائش سے تاریخ وفات اور مقام وفات تک ہی کھیں لیکن بی جاو کے لئے کوئی کچھماں سے یہ شرطیں پوری کرے ان کی تاریخ پیدائش سرے سے کسی کو معلوم ہی نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دنیا کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بھی جنم لیا ہو گا۔ وہی وفات کی بات تو اللہ نہ کرے دشمنوں کے کان پہرے، بس یوں سمجھیے کہ قیامت کے بورے یہی سمجھ لیں۔ ذات پات سے توان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان بیجاری کے خاندان کا بھی کوئی اللہ کا بندہ آج تک تصفیہ نہ کر سکا۔ آخر میں یہ کس کھیت کی مٹی مگر کوئی کچھ بھی کہے میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ ہونہ ہوا ان کا رشتہ ذات شریف سے ضرور ہے اور کیا عجب کہ انھیں کی اولاد سے ہوا میں نے یہ اندازہ ان دونوں کے مزاجوں کی یکسانیت سے لگایا ہے۔

ان کی عمر کا اندازہ لگانا بھی خاصا مشکل کام ہے بھی کوئی عمر ہو تو بتائی جائے یہ تو ٹھیکیں سدا بہار البتہ سوانگ بھرتی رہتی ہیں موقعہ اور وقت کے لحاظ سے جس بھیس میں چاہیں دیکھ لیجئے اور اگر لیری دنیا میں نہیں تو کم از کم ہندوستان کے ہر خاندان میں یہ پائی جائیگی کہیں دھوین میں تو کہیں جہیز کسی گھر میں ماما میں تو کہیں استانی پھر دیکھئے تو ساس، ہوا، سند، بھا، دج، دیورانی، جھٹانی جیسے نازک رشتوں میں ان کا موجود رہنا لازمی ہے اور آگے بڑھیے تو دوست احباب اور محلہ والوں میں بھی کسی نہ کسی روپ میں نظر آئیگی بس یہ سمجھ لیجئے کہ شیطان کے بعد ان کا دوسرا



بھونک بھونک کر بھاتی ہیں کہ آگ بجھتی نہیں بلکہ رخ پلٹ دیتی ہے اور بنی جالو صاف  
 بچ نکلتی ہیں یہ ان کی بھونک کا کرشمہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس کو اللہ رکھے اس کو کون  
 چکھے ہاں تو صاحب جب بنی جالو کی بات چل ہی پڑی ہے تو کیا ضروری ہے کہ بیدار  
 سے ہی بات شروع ہو آخر اوصاف بھی تو کچھ قیمت رکھتے ہیں انہیں یہ کچھ روشتی پڑ جائے  
 تو کیا برائی ہے۔

آگ لگانا تو ان کا مشغلہ ہی ٹھہرا ایک بڑی خوبی بھی ہے وہیے منافقت۔ اجوان  
 کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی اور خود منافق ہیں چنانچہ ہر ایک کو اپنا جیسا ہی سمجھتی  
 ہیں اور منافقت کا بھونڈا لباس پہن کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ گویا اس سے بہتر  
 کوئی لباس نہیں۔ جب آپ سے ملیں گی تو جتنی دیر آپ کے ساتھ رہیں گی آپ پر مدد  
 اور قربان ہوتی رہیں گی اور پیٹھ پیچھے آپ کی پشتوں تک کو اس طرح گن کر رکھ دیں گی گویا آپ  
 کے جدا علی ان کی بیٹی کے بیٹے پیدا ہوئے تھے انکا دل بھی بہت کمزور ہوتا ہے متنبہ پر سچی اور  
 صاف بات کرنے سے ہمیشہ کتراتے ہیں ہماری آپ کی خبریں اچھی سے ہم خود واقف نہیں بنی جالو  
 کی زبانی آپ کو دوسروں سے معلوم ہوں گی اور پہلی بار آپ کو اپنی کمزوریوں کا پوری طرح  
 احساس ہوگا اور بعض ایسی باتوں کا انکشاف ہوگا کہ آپ حیران ہو جائیں گے میں تو کہتی  
 ہوں بنی جالو کی ان ہر باتوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کیوں کہ ٹھنی بدنام بھی ہوں گے تو کیا  
 نام نہ ہوگا!!!

یہ جھوٹ بڑی معصومیت سے بولی ہیں اگر کسی نے اپنی عزت کو خطرے میں ڈال کر  
 بوجھ لیا کہ بھی تم نے فلاں بات جھوٹ کیوں کہی تو بڑی معصومیت سے جواب ملے گا  
 اے ہے اللہ قسم ایمان سے مجھے یاد نہیں مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے تو خود  
 جھوٹ سے نفرت ہے ”دیگرہ و دیگرہ اب بنی جالو کا کچھ بگاڑ سکیں تو بگاڑ کر بتائیے ”بھول“  
 کے خود بھورت بہا ہے میں بات بھنی چلی گئی اور بنی جالو معصوم صورت بنا کر ہمتان لگاتے

والوں کو کوڑ پھیلا پھیلا کر کوستی رہیں گی۔ اور جب ان کے پاس سے اٹھے تو دل میں یہ خیال کہ شاید بی جملو سچ ہی کہتی ہوں گی جھوٹ تو بیچاری جھگڑے کو ختم کرنے کی نیت سے بولتی ہیں لیکن اب زبردستی جھگڑا طویل پکڑ جائے تو یہ کیا کریں یہ طبعیتاً بڑی جل لکڑی والی واقع ہوئی ہیں کسی کی اچھی تعریف تو یہ بہم کر ہی نہیں سکتیں تو بھلا شہرت کہاں سے برداشت ہوگی بس صبح سے شام تک جلایے کی آگ میں جلتی رہتی ہیں ان کے خاندان کی یا پہچان والے کی جہاں چار لوگوں نے تعریف کی کہ انھوں نے عیب گناہ شروع کئے کسی کے عیبوں کو تلاش کرنا اور خوبصورتی سے ان کا بیان کرنا بی جملو ہی کا حصہ ہے میں بھی اس کی قائل ہوں کہ آدمی بات کرے تو ایسی کہ کم از کم اس کا کچھ اثر سننے والے پر تو ہو یہ خوبی بی جملو میں ہے کہ بی جملو کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بہت ہی دیرپا اثر رکھتا ہے اور اس اثر کو زائل کرنے کے لئے لوگوں نے بڑے پاپڑیلے ہیں بلکہ کبھی تو عریں گزار دی ہیں بی جملو جاہلوں میں جاہل اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ہمارے تعلیم یافتہ شخصیت نظر آتی ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں یہ اپنے موقع اور وقت سے پورا فائدہ اٹھاتی ہیں جاہلوں میں بیٹھنکی تو خود بھی اسی رنگ میں نظر آئیں گی اور ایسے انداز چنگاری پھیلانے کی کہ اللہ دے اور بندے اگر تعلیم یافتہ طبقہ میں جلوہ افروز ہوں گی تو ایسی فلسفیانہ اور منطقیانہ ڈھنگ سے زہر گھولیں گی کہ آپ ششدر رہ جائیں اور جب زہر پوری طرح حرٹھ جائیگا تو یہ ہمارے دیرانہ لیجے میں اسباب کا اعلان کریں گی کہ آپ لوگ پڑھے لکھے ہو کر جاہلوں جیسی ذہنیت رکھتے ہیں اور آپ بی جملو کے زہر بلا ڈنک مار کر بھی اکیونہ بلب لانے پر مجبور کر دیں گی اور یہی گویا ان کی کامیابی ہے

اگر بی جملو کو کسی میں غزنی نظر آتی ہے تو وہ صرف ان کی اولاد ہے اس کی کوئی کمزوری ان کو دکھائی نہیں دیتی اور یہ خوبی بی جملو کے یہاں خاندان در خاندان جلتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سگی بہنوں کی اولاد بھی ایس میں ایک دوسرے میں کیڑے نکالنے لگتی ہے بی جملو

جب خود صاحبِ اولاد ہو جاتی ہیں تو گویا ان کے نزدیک جتنی مائیں ہیں وہ سب ناکارہ ہیں کسی میں نہ ماں سینے کی صلاحیت ہے نہ بچے کی پرورش کے گریسے واقف ہیں یہ اوصاف تو صرف بنی جالو میں ہے کہ جس کے بچے کچھ تو ذاتِ شریف اور کچھ بنی جالو کے نقشِ قدم پر چل کر بنی جالو کے نام کو زندہ رکھتے ہیں۔

بہر حال بنی جالو سے چاہے کسی کو کتنی ہی شکایت ہو ہم ان پر کوئی الزام نہیں رکھنا چاہیے دنیا کی نظر میں میں نے مانا کہ بنی جالو کی حرکتیں ایسی نہیں کہ ان کو معاف کیا جائے مگر میں کہتی ہوں کہ بھی ان کے دل کو دیکھئے آخر ان کو کیا لگ کتے تے تو نہیں کاٹا کہ وہ خواہ مخواہ جھگڑے کر داتی پھریں میں تو پھر یہی کہوں گی کہ وہ دل سے عجیب ہیں وہ تو سب کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں دوسروں کی خوشی ان کی خوشی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ خاندانوں میں خوشی کو داغی شکل دینا چاہتی ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ ان کے دخل در معقولات سے اچھے دل برے ہونے جاتے ہیں اور اطمینان و سکون ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے۔ ادھر کی بات ادھر ضرور کہتی ہیں لیکن بری نیت سے نہیں۔ اوہ تو صرف بات کو برا اثر بنانے کے لئے سچ میں جھوٹ کی چاشنی دیتا چاہتی ہیں اور اتفاق کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جھوٹ کی آمیزش زیادہ ہونے سے بجائے چاشنی کے تلخی پیدا ہو جاتی ہے اسے صاحبِ آخر ساری ذمہ داری ان پر ڈالی ہی کیوں جاتی ہے ان کی بات سن کر کچھ اپنی عقل بھی استعمال کیجئے جب کانوں کی کچھ ہوں گی تو بنی جالو تو اس طرح تلخی کا تاراج بچاتی رہیں گی۔

نمبر ہے۔ شیطان تو استفادہ پر مبنی ہے بھاگ بھی جاتا ہے لیکن ان پر کسی متر کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ذات شریف تو اپنے نام ہی سے اپنی شرافت کا ڈھنڈو دیا بیٹے سے ہیں لیکن بی جالو خدا جانے کس علت میں مشہور ہو گئیں۔ بات یہ ہے کہ وہ جو شاعر نے کہا ہے ناکہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے بس وہی معاملہ بی جالو کا بھی ہے ان سے کسی کا دکھ درد دیکھا نہیں جاتا جب دیکھو کسی نہ کسی کے درد میں مبتلا ہیں۔ ہر ایک کی ہمدردی میں دہلی ہوئی جاتی ہیں اب یہ ادب بات ہے کہ ان کی ہمدردی کا ڈھنگ کچھ دنیا سے نرالا ہے اپنے نزدیک تو یہ عم گساری کرتی ہیں لیکن بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اس کو بد نفسی ہی کہئے کہ تنگی کریں اور گناہ لازم آجائے۔ حالانکہ بقول بی جالو کے کہ ”میرا اللہ جانتا ہے میں نے تو اپنی محبت اور خلوص میں ہمدردی کی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی بنفس میں چنگاری کا کام دے گی غریب کئی بار تو بے رحمی ہیں کہ آئندہ کسی کے پھٹے میں یاوں نہ ڈالینگے لیکن کیا کریں دکھیا دل کے ماحول مجبور ہیں۔ جب ان سے بیوی کی طرف سے میاں اور ساس کی طرف سے بہو کی بے توجہی ہوتی دیکھی جاتی تو منہ سے کچھ نہ کچھ نکل ہی جاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ان کے دل کو کیوں نہیں دیکھتے بس ان کی زبان سے کہے ہوئے ہر لفظ کو غور سے سنتے ہیں اور آپس میں جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ان غریب کو تو جھگڑوں سے سخت نفرت ہے خود ہی کہتی ہیں کہ رٹائی جھگڑوں سے ان کا جی کا نینسا ہے پھر نہ جانے یہ کس طرح ہر جھگڑے میں کھینچی کھینچی پھرتی ہیں۔! اور جب ان کی کھینچائی شروع ہوتی ہے تو ایسی دادیں دیا کریں گی ایسی دہائیاں دیں گی کہ آپ خلوص کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گی اور بی جالو پھر دھوبی بیٹا چاند کے مصداق نظر آئے گی۔ مجھ میں چنگاری ڈالکر دور سے سلگنے کا تماشا دیکھنا بی جالو کا بہت ہی دلہند مشغلہ ہے اور آگ کے رخ کو موڑنا ان کے فن کا مکمل ہے جب چنگاری سے مجھ میں شعلہ بلند ہونے لگے اور اتفاق سے بی جالو کے داس کو اس سے تو ایسی خوبصورتی سے

نام سے مخاطب کرتا ہے خوش اخلاق اور محنتی لوگ میں مگر عزت کو دھکا نہیں گئے دیتے۔ مالک کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے اور جی حضوری کرینکا وہاں تصور بھی کیا جانا ناممکن ہے کاش ہمارے یہاں بھی ایسا ماحول پیدا ہو جائے۔ غرض یہ کام سے پیچھے نہیں ہٹتے اسی لئے یہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا اور اگر کچھ دن بیکار رہنا بھی پڑے تو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی رہتی ہے وہاں کی خوش حالی کے دو بڑے سبب یہی ہیں کہ آبادی کم ہے اور کام میں جتنا جینس نہیں کہتے وہاں عزت انساں کی کی جاتی ہے عہدوں کی نہیں!

تعلیمی نظام بھی مجھے بہت پسند آیا۔ پانچ سال کی عمر سے بچے کا اسکول شروع ہوتا ہے۔ ہائی اسکول تک تعلیم ضروری اور وقت سے بچے پر انفرادی توجہ دی جاتی ہے غیر معمولی ٹیوٹوں کی ذہانت کو چلا بخشتے کیلئے پورے موقع فراہم کئے جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ان کی سطحی جانوں کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ نہیں لاداجاتا معدور بچوں کیلئے ان کی ضروری کے لحاظ سے اسکول کھولے گئے ہیں جہاں ان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تم بھی عام انسانوں جیسی زندگی گزار سکتے ہو زیادہ تر اسکول کے بچے ہی تمام کے وقت اختیار تقسیم کرنے کا کام کرتے ہیں اور جو کمیشن ملتا ہے اپنے شوق کی چیزیں خریدتے ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد اکثر بچے پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ کالج کی تعلیم بہت تنگی سے کالج ملے ہی بچے پہنچ جاتے ہیں جن میں علم کی لگن ہو ایسے بچے دن میں کام کر کے رات کے کالج میں شریک ہوتے ہیں یعنی اپنی تعلیم کا خرچ خود ہی اٹھالیتے ہیں یا پھر غیر معمولی صلاحیت کے حامل طالب علم کو حکومت اپنے خرچ سے تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں ایک عورت مرد کے ساتھ برتاؤ نظر آئے گی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی اور ملازمتوں میں بھی 'دکاتوں' دفتروں، اسکولوں اور میسٹروں میں جہاں عورت مختلف حیثیتوں میں نظر آئے گی۔ وہ ایسے کام کرتے بھی دکھائی دیں گی جس کو ہم ہندوستانی صرف مرد کا حصہ سمجھتے ہیں مثلاً لیس ٹرک اور بڑی بڑی مشینیں بھی عورت مرد ہی کی طرح چلاتی ہے کنڈین عورت بہت مضبوط ہے حد محنتی اور خود اعتمادی کے فتنے میں سرشار رہتی ہے کسی کی دست نگر رہنا پسند نہیں کرتی قانون